ابنِ صفی

جلد نمبر
37

جاسوسی دنیا

109- بھیڑیئے کی آواز
110- اجنبی کا فرار
111- روشن ہیولیٰ
112- زرد فتنہ

جاسوسی دنیا

جلد نمبر 37

109 بھیڑیئے کی آواز

110 اجنبی کا فرار

111 روشن ہیولیٰ

112 زرد فتنہ

ابن صفی

اسرار پبلی کیشنز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

اردو بازار لاہور۔فون : 7321970 - 7357022

جملہ حقوق محفوظ

اس ناول کے نام ، مقام، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلشر..........خالد سلطان
پرنٹر............یمانی پریس

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز
الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور۔فون : 7321970

جاسوسی دنیا نمبر 109

بھیڑیے کی آواز

(مکمل ناول)

پیش رس

''بھیڑیئے کی آواز'' ملاحظہ فرمایئے۔

میں نے پچھلی کسی کتاب کے پیشرس میں غیر ملکی ایجنٹوں کی ایک حرکت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یعنی وہ افواہیں پھیلاتے ہیں۔ ایسی افواہیں جو ہمارے قومی شیرازے کو منتشر کرسکیں۔ صوبائی عصبیت کا پرچار اس کا واحد ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہر ایسی افواہ کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجئے جس میں صوبائی عصبیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اس پر ایک صاحب نے مجھے لکھا ہے۔

''جہاں دو چار مل بیٹھتے ہیں وہاں ہر طرح کی باتیں ہوتی ہیں مثال کے طور پر کوئی صاحب کوئی ایسا قصہ سناتے ہیں جس میں ایک صوبے کے فرد پر کسی دوسرے صوبے کے آدمی کی زیادتی کا ذکر ہو تو آپ اسے افواہ سازی کس طرح کہیں گے جبکہ وہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہو۔''

ان صاحب کا خط طویل ہے لیکن یہ ٹکڑا خصوصیت سے جواب طلب ہونے کی بناء پر میری توجہ کا مرکز بنا۔ گزارش ہے کہ واقعہ سنانے والے کو آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی یہ تو سمجھا ہی سکتا ہے کہ وہ دو صوبوں کی بجائے دو نالائق پڑوسیوں کی بات کریں۔ دو نالائق بھائیوں کی بات کریں جو وقتی غصے کے تحت ایک دوسرے کو قتل کردینے پر بھی آمادہ ہوسکتے ہیں۔ ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والوں کو میں نے آپس میں کٹتے مرتے دیکھا ہے۔ آپ دو صوبوں کی بات لئے پھرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے واقعات کو صوبائی رنگ دینا دانشمندی نہیں ہوسکتی۔

ابن صفی

۴ر جنوری ۱۹۷۱

لڑکی کی غراہٹ

وہ ایک معمولی سی شام تھی۔ لیکن کیپٹن حمید کے لئے بے حد حیرت انگیز تھی۔ حیرت انگیز یوں تھی کہ اسی شام کو ایک حیرت انگیز فرض اسے سونپا گیا تھا۔ ویسے تو یہ بات بجائے خود حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ حمید جس کا سابقہ ہی حیرت انگیزیوں سے رہتا تھا اس کے لئے حیرت انگیزی کوئی معنی رکھتی ہو۔

لیکن یہ معاملہ محض اس لئے اس کی نظروں میں خاصی اہمیت رکھتا تھا کہ مضحکہ خیز تھا۔ اب اسے مضحکہ خیز ہی نہ کہیں گے تو پھر کیا کہیں گے کہ ان کا محکمہ شادی بیاہ اور بردکھاوے وغیرہ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

اسے کسی کا یہ شعر یاد آ رہا تھا اس وقت ؎

خفیہ پولیس خانہ دل میں چھپی نہ ہو
تیر نظر چلائیں ذرا دیکھ بھال کر

ایک صاحبزادے اس کے حوالے کئے گئے تھے اور کہا گیا تھا کہ وہ بردکھاوے میں جارہے ہیں۔ اسے ان کے رفیق کی حیثیت سے ساتھ جانا پڑے گا۔ یہ حکم محکمے کے سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے ملا تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ اس سلسلے میں بقیہ احکامات روانگی سے قبل ریلوے اسٹیشن پر مل جائیں گے۔

بردکھاوے میں جانے والے نوجوان کو کاغذی طور پر اس کے حوالے کیا گیا تھا۔ ابھی تک اس نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے لئے گھر پہنچا لیکن کھانے کی میز پر فریدی سے ملاقات نہ ہوسکی۔
فریدی آج صبح ہی صبح کہیں چلا گیا تھا۔ ناشتے پر بھی اس کا ساتھ نہیں ہوسکا تھا۔
اب اسے بقیہ احکامات کا انتظار تھا۔ کیونکہ پانچ بجے شام کو ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا ضروری تھا۔ خالی ہاتھ نہیں بلکہ سامان سفر کے ساتھ۔

ساڑھے چار بجے تک وہ بڑی بے چینی سے فریدی کا انتظار کرتا رہا لیکن اس کی واپسی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ پھر وہ شدید ترین جھنجھلاہٹ کے عالم میں گھر سے ریلوے اسٹیشن کے لئے روانہ ہوگیا تھا۔

اسے اس کی فکر بھی نہیں تھی کہ اسٹیشن پر اس نوجوان سے ملاقات کی کیا صورت ہوگی۔ کون تعارف کرائے گا۔ یہ تو معلوم تھا کہ نصیر آباد جانا ہوگا۔

وہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔

یہاں آٹھ افراد پہلے سے موجود تھے۔ وہ ایک خالی کرسی پر جا بیٹھا اور ایک ایک کا بغور جائزہ لینے لگا۔ ان میں کوئی بھی بردکھاوے کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔ آٹھوں معمر تھے۔
کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک قوی الجثہ بوڑھا آدمی اسے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اسکے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے۔ لیکن چہرے پر جوانوں کی سی توانائی تھی۔
کچھ دیر بعد ٹرین کی آمد کی اطلاعی گھنٹی بجی اور وہ بوڑھا آدمی حمید کو گھورتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔

ٹھیک اسی وقت اس کے اپنے محکمے کا ایک آدمی ویٹنگ روم میں داخل ہوا۔ یہ سپرنٹنڈنٹ کا پی۔ اے تھا۔ اس نے حمید کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسی بوڑھے کی جانب اشارہ کر کے الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

حمید نے طویل سانس لی۔ ہوں تو یہ بوڑھا کھوسٹ جارہا ہے بردکھاوے میں اور اسے اس کی رفاقت کرنی پڑے گی۔

اس نے سوچا برخوردار! تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اگر اس رفاقت کی یادیں تمہیں زندگی بھر نہ تڑپائیں تو سہی! بوڑھے کے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھ گیا ...... اور پھر اس کے پیچھے ہی پیچھے ویٹنگ روم سے نکل کر پلیٹ فارم پر آیا تھا۔

گاڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ بوڑھا پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

حمید ٹہلتا رہا۔ لیکن بوڑھے کو ایک پل کے لئے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

ایک جگہ اچانک سارجنٹ رمیش سے مڈبھیڑ ہوگئی اور وہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اور ایک لفافہ تھما کر رخصت ہوگیا۔

ایک سوٹ کیس وہ خود ساتھ لایا تھا۔ پھر اس دوسرے سوٹ کیس کی کیا ضرورت تھی۔

لفافے پر اس کا نام تحریر تھا اور رائٹنگ فریدی کی تھی۔ اس نے لفافہ جیب میں ڈال لیا اور اسی جگہ واپس آ گیا جہاں اپنا سوٹ کیس رکھا تھا۔

اتنے میں ٹرین آ پہنچی۔ بوڑھے نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ایک ایئر کنڈیشنڈ کوپے کے سامنے آ رکا۔ پھر حمید نے اسے اس میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ جہاں تھا وہیں ٹھہرا رہا اور اب اس نے جیب سے لفافہ نکال کر چاک کیا۔ تحریر فریدی ہی کی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''سپرنٹنڈنٹ کی خواہش ہے کہ تمہیں تنہا کام کرنے کے بھی مواقع دیئے جائیں۔ اس سوٹ کیس میں میک اپ کا سامان ہے۔ خود اعتمادی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔''

حمید نے طویل سانس لی اور خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور خود بھی اسی کوپے کی طرف بڑھا۔

لیکن اس کے پاس نہ تو ریزرویشن کی رسید تھی اور نہ ٹکٹ تھا۔ وہ کوپے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کا پی۔ اے پھر دکھائی دیا جو ٹرین کنڈیکٹر کے ساتھ اسی طرف آ رہا تھا۔

ٹرین کنڈیکٹر نے قریب پہنچ کر حمید سے کہا۔ ''میرے ساتھ تشریف لایئے جناب۔''

اور پھر وہ بھی اس کے ساتھ اسی تھری سیٹر کے کوپے میں داخل ہوا تھا۔ بوڑھا اپنی سیٹ پر نیم دراز نظر آیا۔

کنڈیکٹر دوسری سیٹ کی طرف اشارہ کر کے باہر چلا گیا۔ حمید نے سیٹ پر بیٹھتے وقت سرہانے لگے ہوئے کارڈ پر نظر ڈالی تھی۔ جس پر تحریر تھا۔ ''نواب زادہ ساجد حمید۔''

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً بوڑھا ہنس کر بولا۔ ''میں نے آپ کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ یور ہائی نس......!''

''کیا مطلب......!'' حمید کا لہجہ سخت تھا۔

[redacted]

''میں آپ کے خاندان کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کے دادا حضور ''اعتماد الدولہ'' کی خدمت میرے باپ نے کی تھی۔''

''اعتماد الدولہ......!''

''بس فی الحال خاموش رہئے۔ ٹرین کو چلنے دیجئے! پھر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔ میں آپ کے والد حضور کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھ پر اس حد تک اعتماد کیا۔''

''تعارف حاصل کرنے کا یہ ایک گھٹیا طریقہ ہے۔!'' حمید غرایا۔

بوڑھا مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ ویسے اس کی گفتگو نے حمید کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔

اتنے میں ایک شعلہ جوالہ جین اور جیکٹ میں ملبوس کوپے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے قلی سامان اٹھائے ہوئے اندر آیا تھا۔

لڑکی نے اچٹتی سی نظر ان دونوں پر ڈالی اور سامنے والی برتھ پر بیٹھ گئی۔

قلی اس کا سامان رکھ چکا تو اس نے پرس سے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر قلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیپ دی چینج......!''

''جی میم صاحب......؟''

''باقی پیسہ تم رکھ لو......!'' وہ جھلا کر بولی۔ ''جاہل اتنی بھی انگریزی نہیں سمجھ سکتے۔''

''سلام میم صاحب۔'' قلی نے بڑے ادب سے اسے سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

تیکھے نقوش والی اس لڑکی نے حمید کو سچویشن سے بیگانہ کر دیا۔

وہ اپنی الجھن کو پس پشت ڈال کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

دفعتاً بوڑھا آدمی کھکارا اور حمید چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اسے اس دلچسپی سے باز رکھنا چاہتا ہو۔

''کیا بات ہے؟'' حمید نے بوڑھے کو انگریزی میں مخاطب کیا اور لڑکی بیساختہ ہنس پڑی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور لڑکی نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''کیا تم اپنے جاہل نہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہو۔''

''کیا مطلب......؟'' حمید نے بگڑے ہوئے موڈ کا مظاہرہ کیا۔

''کیا یہی بات تم اردو میں نہیں کہہ سکتے تھے۔''

[redacted]

''میں اجنبیوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔'' حمید بداخلاقی پر اتر آیا۔

اچانک بوڑھا دخل اندازی کر بیٹھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''محترمہ براہِ کرم بات نہ بڑھایئے...... پرنس کی خوش مزاجی ان کی بہتر صحت کے لئے ضروری ہے۔''

''پرنس.....!'' لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اتنے میں گاڑی بھی چل پڑی۔

لڑکی چند لمحے حمید کو عجیب نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر اس طرح جھک جھک کر حمید کو دیکھنے لگی جیسے بوڑھے کے بیان کی تصدیق کرنے کیلئے کسی خاص علامت کی تلاش میں ہو۔

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔'' حمید بھنا کر اٹھتا ہوا بولا۔

''نہیں شہزادے صاحب تمہاری صحت کیلئے خوش مزاجی ضروری ہے۔'' لڑکی ہنس پڑی۔

''محترمہ......محترمہ......!'' بوڑھا آدمی مضطربانہ انداز میں بولا۔

''کیا محترمہ...... محترمہ...... کر رہے ہو...... کھینچو زنجیر......!'' حمید دہاڑا۔ ''ہم اس نامعقول ٹرین سے سفر نہیں کریں گے۔''

''ایسا بھی کیا شہزادے صاحب.....یہ اکبرِ اعظم کا زمانہ نہیں ہے۔'' لڑکی بدستور ہنستی رہی۔

''خدا کے لئے محترمہ......!'' بوڑھا گڑگڑایا۔

''کھینچو زنجیر......اور اتار لے جاؤ اپنے شہزادے صاحب کو۔ میں اپنے آس پاس کسی نکچڑھے آدمی کا وجود برداشت نہیں کرسکتی۔''

''آپ کیسی ناسمجھی کی باتیں کر رہی ہیں۔'' بوڑھے نے کہا۔

''مجھے تمہاری موجودگی پر اعتراض نہیں ہے۔'' لڑکی نے مڑ کر نرم لہجے میں کہا۔ ''صرف اپنے شہزادے صاحب کو لگیج کیریئر یا ڈاگ کیریئر میں بند کرادو۔''

''ڈاگ کیریئر میں ایسی اعلیٰ نسل کی کتیا کہاں ملے گی۔'' حمید بولا۔

''تو تم یہیں بھونکتے رہو گے۔'' لڑکی نے بے بسی سے کہا اور اپنی برتھ پر جا بیٹھی۔

حمید سوچ رہا تھا سفر اچھا گزرے گا......اس نے تمباکو کی پاؤچ نکالی اور پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

''تم کاریڈر یا باتھ روم میں تمباکو نوشی کرو گے...... یہاں نہیں۔'' لڑکی پھر بول پڑی۔

''بھونکتی رہو......میں عادی ہوں اس کا۔''

''میں ابھی تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گی۔ میرے باپ ریلوے میں سب سے بڑے آفیسر ہیں۔''

''اوہو تو کیا اس محکمے میں یتیم خانے بھی ہیں۔''

''پرنس خدا کے لئے آپ ہی خاموش رہئے۔'' بوڑھا بولا۔

''مناسب یہ ہوگا کہ تم ہم دونوں کو تنہا چھوڑ دو۔''

''بہت بہتر جناب! میں ڈائننگ کار میں جارہا ہوں۔'' بوڑھے نے برتھ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مم...... میں بھی چل رہی ہوں۔''

''تم چلی جاؤ گی تو پھر زنجیر کون کھینچے گا۔'' حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ بھی درست ہے۔'' بوڑھے نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔

''کیا درست ہے؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''آپ بھی چلی گئیں تو پرنس تنہا رہ جائیں گے۔ یہ بھی ان کی صحت کے لئے مضر ہے۔''

''تو کیا میں تمہارے پرنس کے باپ کی نوکر ہوں۔'' وہ جھلا کر بولی۔

''انسانی ہمدردی محترمہ۔'' حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''آپ مجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں۔ ابھی ابھی میں نے آپ کے چہرے میں یونان کی سائیکی کی جھلک دیکھی تھی۔ اب میں آپ کا احترام کروں گا۔''

''مجھے تو تم دونوں ہی فراڈ معلوم ہوتے ہو۔''

''جی نہیں! صرف میں فرہاد ہوں......!'' حمید نے بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ان کی عمر اب اس قابل نہیں رہی۔''

''تم سچ مچ بہت بدتمیز ہو۔''

''محترمہ...... محترمہ......!'' بوڑھا گڑگڑایا۔

''میں کنڈیکٹر کے پاس جارہی ہوں۔''

''مجھ جیسے ذی عزت آدمی کو چھوڑ کر۔'' حمید نے سوال کیا۔

لیکن وہ مزید کچھ کہے بغیر بوگیوں کو ملانے والے دروازے سے نکل گئی۔

''یور ہائی نس......!''

''خاموش رہو......اور بیٹھ جاؤ۔'' حمید دہاڑا۔''اور اب مجھے بتاؤ کہ اعتماد الدولہ کے بیٹے کا کیا نام ہے۔''

''حضور......حضور......کیا آپ اپنے والد حضور کا نام نہیں جانتے۔''

''ہم اگر اتنے بے خبر نہ ہوں تو پرنس کیوں کہلائیں۔''

''نواب اقتدار الدولہ جناب۔''

''اور ہم صرف ساجد حمید ہیں......ہم کوئی دولہ کیوں نہیں۔''

''آپ تو دولہا ہیں......میرے حضور۔''

اس پر حمید کا ماتھا پورے طور ٹھنکا تھا۔تو کیا......تو کیا......اسے بیوقوف بنایا گیا ہے۔

''بڑے میاں سچ سچ بتاؤ تم کون ہو......ورنہ اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دوں گا۔''

بوڑھے کی آنکھوں میں بدمزگی کے آثار نظر آئے اور اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

کارڈ پر تحریر تھا۔''عبدالرؤف صمدانی......منیجر لکی کارپوریشن......!''

''پھر تم دادا کے نمک خوار کیسے ہوئے......!'' حمید نے بھنا کر پوچھا۔

''میرے باپ ان کی سرکار میں ملازم تھے......میں نے کچھ دنوں تک آپ کے والد حضور کی خدمت کی ہے۔ اس کے بعد وہاں سے آب و دانہ اٹھ گیا تھا۔ بزنس لائن میں پڑ گیا۔ میں دراصل اس کارپوریشن کا سب سے بڑا حصہ دار بھی ہوں۔''

''اپنے والد حضور کا یہ خط لیجئے۔'' اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور حمید کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔''ہم لوگ بہت ہی خاص مواقع پر یاد کئے جاتے ہیں۔''

حمید نے لفافے سے خط نکالا جس سے ایک فوٹوگراف پھسلتا ہوا اس کی گود میں آ گرا۔ یہ خود اسی کا فوٹوگراف تھا۔

خط میں لکھا تھا۔

''صمدانی میاں!

اس یقین کے ساتھ کہ تمہیں بھی اپنے باپ کا عہد یاد ہوگا۔

[redacted]

تمہیں یہ خط لکھا جارہا ہے۔ ہمارے عم نامدار کے حضور ہم کو تمہارے
والد لے گئے تھے۔ تم ہمارے لخت جگر کو اسکے چچا کے پاس لے جاؤ۔
افتخار الدین اس کا نام ہے۔ اس لئے تصویر بھی بھیجی جارہی ہے کہ تم
اسے پہچان سکو۔ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں وہ تمہیں ملے گا۔ کل
شام پانچ بجے۔ آخر میں یہ دُعا ہے کہ اللہ ہمارے درمیان اس روائت
کو تا قیامت برقرار رکھے۔ آمین۔

دعا گو

اقتدار الدولہ''

خط پڑھ کر حمید نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میرے باپ کا نام چوہدری حمید ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اقتدار الدولہ ہونے کا شرف انہیں کب حاصل ہوا۔''

''واللہ.....خوش مزاجی آپ کے خاندان کا طرہ امتیاز ہے۔'' بوڑھا صمدانی ہنس کر بولا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن تم لوگوں کی وفاداری کا بھی جواب نہیں۔''

''یہی عزت افزائی ہماری جاں نثاری کا سبب رہی ہے یور ہائی نس۔''

''تو ہم دولہا ہیں۔''

''یقیناً یور ہائی نس......!''

''لیکن ہمارے والد حضور نے تو ہمیں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''یہ عین روایت کے مطابق ہے۔ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ ان کے ساتھ میرے والد گئے تھے۔''

''گئے ہوں گے۔'' حمید نے لاپروائی سے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔

''مناسب یہی ہے کہ آپ بھی لاعلم ہی رہیں۔''

''لاعلمی میری جنت ہے۔'' حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''جاؤ۔ اس لڑکی کو تلاش کرو۔''

''یہ مناسب نہ ہوگا پرنس۔''

''ہماری طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے یہ بات۔''

[redacted]

''آپ بردکھاوے کے لئے جارہے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے۔''

''جب ایک لڑکی ہمیں ناپسند کرسکتی ہے تو دوسری بھی کردے گی۔ ہم اس سلسلے میں ذرا اپنا اطمینان کرلینا چاہتے ہیں۔''

''آپ مجھے الجھن میں ڈال رہے ہیں جناب عالی۔''

''مسٹر صمدانی!''

''آپ صرف صمدانی کہہ سکتے ہیں۔ مسٹر کہلوانے کا شوق نہیں ہے مجھے۔'' صمدانی کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔ لیکن انداز خیر اندیشانہ ہی تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں خود جارہا ہوں اس کی تلاش میں۔ تم یہیں بیٹھو۔''

''آپ کی مرضی......؟''

حمید اٹھ گیا۔ خواہش چائے کی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈائننگ کار تک پہنچنے کے لئے اسے دو بوگیوں سے گزرنا پڑا۔

سامنے ہی میز پر لڑکی نظر آئی تھی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر اسکے مقابل بیٹھ گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' وہ بھنا کر بولی۔

''میرا خیال ہے کہ میں ابھی صرف آ کر بیٹھا ہوں۔ بدتمیزی میں کافی دیر لگے گی۔''

''شٹ اپ......!''

''انگریزی میں بُرا نہیں مانتا۔ اگر چپ بے کہتیں تو لازماً میرا ہاتھ گھوم جاتا۔''

''آدمی ہو یا......!''

''پرنس ہوں۔''

''شکل دیکھی ہے......فراڈ کہیں کے۔''

''کتنی بار کہو گی۔''

''تم اٹھ جاؤ یہاں سے۔''

''لوگ مجھے احمق سمجھیں گے۔''

''تم تو صورت ہی سے احمق معلوم ہوتے ہو۔''

''تب تو لوگ مجھے تمہارا شوہر سمجھیں گے۔'' حمید خوش ہو کر بولا۔

[redacted]

''بکواس مت کرو۔''

''اور لوگ تمہیں جھگڑالو سمجھیں گے۔''

''تو میں ہی اٹھی جاتی ہوں۔''

''بہت زیادہ بد دماغ بیوی سمجھ کر لوگ مجھ سے ہمدردی کریں گے۔''

''خدا کرے مرجاؤ تم......!'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''آئندہ کسی مرد سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔'' حمید اٹھتا ہوا بولا اور دوسری میز پر جا بیٹھا۔

لڑکی کے چہرے پر پل بھر کے لئے حیرت کے آثار نظر آئے تھے اور پھر اس طرح معدوم ہوکر رہ گئے تھے جیسے اس میں کسی کوشش کو دخل رہا ہو۔

حمید نے ویٹر کو اشارے سے بلایا اور آہستہ سے بولا۔ ''ان صاحبہ سے پوچھو کیا پئیں گی۔''

''میں نہیں سمجھا جناب۔'' ویٹر کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار تھا۔ لیکن حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''زن مریدی سفر میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ابھی ابھی اچانک مجھ سے خفا ہوگئی ہیں۔''

''اوہ...... میں سمجھا...... جناب...... بہت بہتر۔'' کہتا ہوا وہ لڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے بڑے ادب سے جھک کر لڑکی سے کچھ کہا تھا اور لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ پھر وہ حمید کو گھورنے لگی تھی۔ اتنی سختی سے دانت بھینچے تھے کہ جبڑوں کی وریدیں ابھر آئی تھیں۔

دفعتاً حمید نے محسوس کیا جیسے لڑکی پر غشی طاری ہو رہی ہو۔ قہر میں ڈوبی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جارہی تھیں۔

اور پھر سچ مچ اسکی گردن کرسی کی پشت گاہ پر ڈھلک گئی۔ ویٹر بوکھلا کر حمید کی طرف مڑا۔

''کک...... کوئی بات نہیں ...... فکر نہ کرو۔'' حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ''ان پر دورے پڑتے ہیں اکثر۔''

اس کے قریب پہنچ کر پیشانی پر انگلی سے ٹھوکے دیئے۔ لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔

آخر اس نے اسے ہاتھوں پر اٹھایا اور ویٹر سے کہا کہ وہ اس کا وینٹی بیگ اٹھالے اور اس کے ساتھ کوپے تک چلے۔

[redacted]

بوڑھے صمدانی نے انہیں اس حال میں دیکھا تو بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

حمید نے اسے برتھ پر لٹاتے ہوئے ریزرویشن کارڈ پر نظر ڈالی جس پر ''خان زادی دردانہ'' تحریر تھا۔

ویٹر کو پانچ روپے بطور بخشش دیتے وقت حمید نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا اور بوڑھے کو آنکھ مار کر مسکرایا۔ ویٹر کے رخصت ہونے پر صمدانی نے بوکھلائے ہوئے لہجہ میں استفسار حال کیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ غصے کی شدت کی بناء پر بیہوش ہوگئی ہے۔'' حمید نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن......لیکن جناب......؟''

''تم فکر نہ کرو......خود ہی ہوش میں آجائے گی......لیکن تم ذرا اس پر نظر رکھنا کہ زنجیر نہ کھینچنے پائے۔''

''آپ نے بڑی دشواری میں مبتلا کر دیا ہے جناب۔''

''تم کیسے ساتھی ہو۔''

''ہمیشہ عزت کی زندگی بسر کی ہے میں نے۔ مجھ پر رحم فرمایئے۔''

اچانک خان زادی دردانہ اٹھ بیٹھی اور اس کے حلق سے عجیب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

''بب......بب...... بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے۔'' بوڑھا صمدانی کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''جیسے کوئی بھیڑیا غرا رہا ہو۔''

ٹیکسی ڈرائیور

لڑکی کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ آنکھوں میں درندگی تھی اور چمکدار دانت سچ مچ کسی

[redacted]

بھیڑیئے ہی کے دانتوں سے مشابہہ نظر آنے لگے تھے۔

حمید نے جلدی سے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ چار سو دس بور کی دونالی بندوق نکالی اور لڑکی کا نشانہ لے کر ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔

''یہ.....یہ...آپ کیا کر رہے ہیں جناب عالی!'' بوڑھا صمدانی بُری طرح کانپ رہا تھا۔

''خاموش رہو......جیسے ہی یہ تم پر حملہ کرے گی میں فائر کر دوں گا۔''

پھر اچانک لڑکی پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور حمید نے صمدانی کو آنکھ مار کر کہا۔ ''دیکھا تم نے۔''

لڑکی نے برتھ سے چھلانگ لگائی اور حمید کے قریب پہنچ کر بولی۔ ''ہائے کتنی ننھی سی بندوق ہے......ذرا مجھے دکھاؤ۔''

''لو......لو......ضرور دیکھو......!''

اس نے اس کے ہاتھ سے بندوق جھپٹی اور پھر بھیڑیئے ہی کی طرح غراتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی۔ اس نے حمید کے دل کا نشانہ لے رکھا تھا۔

''وہ تو پہلے ہی گھائل ہے۔ یہاں کا نشانہ لو۔'' حمید نے اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

لڑکی کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں کور کئے ہوئے زنجیر تک پہنچنا چاہتی ہے۔

''دد......دیکھئے جناب۔'' صمدانی ہکلایا۔

''میں دیکھ رہا ہوں۔'' حمید ہنس کر بولا۔ ''بندوق خالی ہے لہٰذا۔''

دوسرے ہی لمحہ میں اس نے نہ صرف اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی تھی بلکہ اسے اس کی برتھ پر جھٹک دیا تھا۔

برتھ پر گر کر وہ اسے بُرا بھلا کہنے لگی اور صمدانی حمید کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''خدارا رحم کیجئے......اس وقت آپ اعتماد الدولہ بہادر ہی کی طرح کھلنڈرے نظر آرہے ہیں۔''

''اعتماد الدولہ......!'' دفعتاً لڑکی اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار تھے۔

''جی ہاں......یہ ان کے پوتے ہیں۔'' صمدانی کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

[redacted]

''بکواس......وہ تو میرے دادا تھے۔'' لڑکی بھنا کر بولی۔ ''آخر تم لوگ میرا مذاق کیوں اڑانا چاہتے ہو۔''

''آپ خان زادی ہیں......اعتماد الدولہ کی اولاد نواب زادہ کہلاتی ہے۔'' صمدانی جز بز ہو کر بولا۔

''وہ میرے دادا کے بھائی تھے۔''

''نہیں......!'' صمدانی اچھل پڑا۔

''اور اسی لئے میں نے چاہا تھا کہ تم لوگ مجھ سے نہ الجھو۔ میرے باپ کو علم ہو جائے تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ خان ظفر یاب......!''

''ہوں......تو تم میرے باپ کے نام سے بھی واقف ہو۔''

''اچھا لڑکی اب بکواس بند کرو۔'' حمید پیر پٹخ کر بولا۔ ''ہم کسی قدر غنودگی محسوس کر رہے ہیں۔''

''اگلے اسٹیشن پر تم دونوں پولیس کی حراست میں ہو گے۔''

''اگر آپ خان ظفر یاب کی صاحبزادی ہیں تو......!'' صمدانی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''اب کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ خان ظفر یاب کی بیٹی اور خان دوراں کی پوتی ہیں تو آپ کو اس کا بھی علم ہو گا کہ دونوں سلسلوں کے درمیان تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔''

''میں پوچھتی ہوں تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

''یہ خان دوراں کی بڑی بیٹی کے بیٹے ہیں۔'' صمدانی نے حمید کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''اگر یہ سچ ہے تو......!'' وہ حمید کو خونخوار نظروں سے گھورتی ہوئی خاموش ہو گئی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ دارالحکومت میں کیوں تشریف لائی تھیں۔'' صمدانی نے پوچھا۔

''اسی خطرہ کے امکان کا جائزہ لینے کے لئے۔''

''اسے آپ خطرہ سمجھتی ہیں۔''

''پھوپھی اماں بزدل تھیں۔''

''ایسا نہ کہئے۔''

وہ پھر حمید کو گھورنے لگی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ''تو یہ بے وقوف آدمی ہمارے گھر جارہا ہے۔ لیکن ٹھہرو......اس گھرانے میں ساجد حمید نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔''

''بزدل ماں کا بزدل بیٹا'' وہ نفرت کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

اس بار حمید بھڑک اٹھا۔ اسے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس نے سچ مچ اس کی اپنی ماں کو کہا ہو!

''تم زبان بند کرو......ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔''

''شٹ اپ......!''

حمید اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ صمدانی بیچ میں آتا ہوا بولا۔ ''آپ صبر وسکون کے ساتھ بیٹھ جائیے جناب عالی! میرا خیال ہے کہ خان ظفر یاب کی کوئی دوسری بیٹی نہیں۔''

''تم ٹھیک سمجھے بوڑھے خبیث......!'' لڑکی آپے سے باہر ہوئی جارہی تھی۔

''میں اس خاندان کا قدیم نمک خوار ہوں۔ آپ کی کسی بات کا بُرا نہیں مانوں گا۔'' بوڑھے صمدانی نے مسکرا کر کہا۔

لڑکی پھر کچھ نہ بولی۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے اپنی برتھ کی طرف واپس آنا پڑا تھا۔

لڑکی کی آنکھوں میں تنفر کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔

بوڑھا صمدانی گھگھیانے لگا۔ ''خان زادی صاحبہ مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہوئی۔ خاندانی روایت کے مطابق پرنس افتخار الدولہ اپنے چچا کی حضور باریابی کے لئے تشریف لے جارہے ہیں۔ خان دوراں کی گڑھی کے درودیوار شاہد ہیں کہ اعتماد الدولہ کی اولاد روایت کی پابند رہی ہے۔''

لڑکی کچھ نہ بولی۔ وہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''دفعتاً حمید بولا۔ ''خان دوراں...... خان ظفر یاب...... اور ...... اور غالباً تمہارے بھائی کا نام خانساماں ہوگا۔''

''شٹ اپ......! یو ڈرٹی سوائین۔'' لڑکی دہاڑی۔

''آواز بُری نہیں ہے۔'' حمید نے صمدانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں دست بستہ گزارش کروں گا۔''

''تم خاموش بیٹھو۔'' حمید نے غصیلے لہجہ میں کہا۔

''بہتر یہی ہوگا۔'' لڑکی بھی صمدانی کو گھورتی ہوئی بولی۔ ''میں اس احمق سے براہِ راست گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہ روایت کے خلاف ہوگا۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں اس روایت پر...... سمجھے۔''

''اب میں اس سلسلے میں قطعاً کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔''

''لیکن میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں پرنس کو خان ظفر یاب کی خدمت میں پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔'' صمدانی بولا۔

''اب یہ شخص زندگی بھر ان کی خدمت میں پیش نہیں ہو سکے گا۔'' لڑکی نے کہا اور اچھل کر برتھ سے اٹھ گئی۔

وہ پھر بوگیوں کو ملانے والے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔

حمید استفہامیہ انداز میں صمدانی کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں کیا بتاؤں پرنس۔'' صمدانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''خود میری عقل چکرا کر رہ گئی ہے۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دونوں ایک ساتھ سفر کریں گے۔''

''او...... چچا...... جو کچھ بھی کہنا ہے ایک ہی بار کہہ جاؤ۔ کیوں مجھے بھی مخبوط الحواس کر رہے ہو۔'' حمید پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

''یہ طرز تخاطب آپ کے شایان شان نہیں ہے۔''

''اچھا تو میں پھر جا رہا ہوں اس کے پیچھے۔''

''اب یہ آپ کا فرض ہے کہ اپنی منگیتر کی نگہداشت خود کریں۔''

''منگیتر...... کیوں حواس باختہ ہو رہے ہو بڑے میاں۔''

''آپ کی تیز مزاجی ہی کی بناء پر اقتدار الدولہ بہادر نے آپ کو اصل معاملے سے لاعلم رکھا ہوگا۔ آپ دنیا کے کسی حصہ میں بھی پلے بڑھے ہوں لیکن آپ کی شادی اسی دستور کے مطابق ہوگی جو سینکڑوں سال سے آپ کے خاندان میں چلا آرہا ہے۔''

''بھلا میں دنیا کے کس حصہ میں پلا بڑھا ہوں۔''

''فرانس میں جناب عالی...... کیا...... کیا آپ مجھے اس قدر لاعلم سمجھتے ہیں۔ آپ صرف پانچ سال کے تھے جب اقتدار الدولہ نے آپ کو ایک ہمدرد فرانسیسی کے حوالے کردیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' حمید بولا۔

''اور آپ پچھلے مہینے تشریف لائے ہیں۔ آپ کے اعزہ آپ کو اس وقت تک نہیں پہچان سکتے جب تک کہ انہیں آپ کی شخصیت سے آگاہ نہ کیا جائے۔''

''قدرتی بات ہے۔'' حمید نے لاپروائی سے شانوں کو جنبش دی۔

''اب باعث تشویش یہ ہے جناب عالی کہ صاحبزادی ادھر کیوں تشریف لائی تھیں اور پھر تنہا...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ خان دوراں کی اولاد اتنی آزاد خیال ہوسکتی ہے۔''

''تو یہ ہمارے یہاں کیوں نہیں گئی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ اقتدار الدولہ نے آپ کو حالات سے اس حد تک بے خبر رکھا۔''

''مجھے حالات کی پرواہ نہیں صمدانی صاحب! ہر قسم کے حالات سے نپٹنا میری ہابی ہے۔ خواہ پہلے سے ان کا علم ہو یا نہ ہو......!'' حمید بائیں آنکھ دبا کر بولا۔

جواب میں صمدانی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دردانہ آندھی اور طوفان کی طرح کوپے میں داخل ہوئی۔

''تو یہ حضرت میرے منگیتر ہیں۔'' وہ حمید کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

''ڈائننگ کار کا ویٹر بھی سخت نامعقول واقع ہوا ہے۔ وہ تو تمہیں میری بیوی سمجھا تھا۔'' حمید بولا۔

''تم خاموش رہو۔ میں ان سے گفتگو کررہی ہوں۔'' لڑکی نے صمدانی کیطرف اشارہ کیا۔

''مناسب یہی ہوگا محترمہ۔'' صمدانی نے کہا...... اس بار اس کا لہجہ سرد تھا۔

''کیا تمہیں اپنے آقا اقتدار الدولہ کے بیٹے کی زندگی عزیز ہے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔''

''تو پھر اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤ اور وہیں سے اپنے شہر واپس چلے جانا۔''

''جی نہیں۔'' حمید بول پڑا۔ ''اب تو اپنے چچا حضور کی خدمت میں ضرور پیش کیا جاؤں گا۔''

''اس سے پہلے ہی آپ کی گردن کٹ جائے گی۔'' لڑکی بھنا کر بولی۔

اس پر حمید نے صمدانی کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی اور سوال کیا ''اب ہمیں کیا کرنا چاہئے...... انکل صمدانی۔''

''آپ بزدل تو نہیں ہیں پرنس۔''

''میں تمہیں بزور شمشیر حاصل کروں گا۔'' حمید نے لڑکی کو گھورتے ہوئے کہا اور اپنے داہنے بازو کی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''میں نے آگاہ کر دیا خطرے سے...... اب تم جانو۔'' لڑکی نے کہا اور برتھ پر نیم دراز ہوگئی۔

صمدانی حمید کے قریب آ بیٹھا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''میں سخت الجھن میں پڑ گیا ہوں پرنس۔ پتہ نہیں ایسے حالات میں اقتدار الدولہ بہادر کیا کرتے۔''

''جاؤ...... اپنی برتھ پر جاؤ...... اس وقت تم اقتدار الدولہ کی حضور میں نہیں ہو۔ اب تمہیں میرے احکامات کا پابند رہنا ہوگا۔''

''بجا ارشاد ہوا۔'' صمدانی نے کہا اور اٹھ کر اپنی برتھ پر جا بیٹھا۔

لڑکی نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ تھا۔ غالباً اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔

حمید نے سوچا خاصی دلچسپی رہے گی لیکن آخر یہ ہے کیا چکر...... محکمہ سراغ رسانی کے سپرنٹنڈنٹ کو شادی بیاہ سے کیا سروکار...... نواب اقتدار الدولہ کا نام اس نے سنا تھا۔ کبھی رہے ہوں گے نواب اب تو ایکسپورٹ امپورٹ کے چکر میں پڑے ہوئے تھے۔

کچھ بھی ہو معاملہ گھمبیر معلوم ہوتا ہے۔ حمید سوچتا اور لڑکی کو گھورتا رہا۔ جو بدستور آنکھیں بند کئے برتھ پر نیم دراز تھی۔

دفعتاً حمید نے صمدانی کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔

اس نے بالکل مشینی طور پر اس کے اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ اتنی آہستگی سے دوسری طرف چلا گیا کہ لڑکی کو علم نہ ہو سکا۔

''محترمہ......!'' کچھ دیر بعد حمید نے اسے آواز دی اور وہ آنکھیں کھول کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ غرائی۔

''گزارش ہے کہ مجھے روایات سے نفرت ہے۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں اس قدیم خاندانی روایت کو توڑ دوں گا۔''

''سچ مچ......!'' دفعتاً لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا۔

''ہاں......لیکن تمہیں دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''اگر اب میں نے اس روایت کو توڑ دیا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی خوبصورت ہو گی۔''

''شٹ اپ......!''

''بُرا نہیں ماننا......فرانس کی بیویاں اپنے شوہروں کی پٹائی تک کر دیتی ہیں......اور میں اسی ماحول میں پلا بڑھا ہوں۔''

''اس خیال کو دل سے نکال دو کہ مجھے حاصل کرسکو گے۔ لاشیں گر جائیں گی۔''

''کیا کوئی جن عاشق ہو گیا ہے تم پر......!''

''میں کہتی ہوں بکواس بند کرو......تم کوئی فراڈ ہو......جس کی زندگی بچپن سے اب تک فرانس میں گزری ہو وہ اتنی بامحاورہ اردو نہیں بول سکتا۔''

''یہ ناممکن نہیں ہے دردانہ بیگم......میں جرمنوں کے سے لہجے میں جرمن بول سکتا ہوں اور فرانسیسیوں کی طرح فرانسیسی۔''

''اُردو کا ماحول وہاں تمہیں کیسے ملا ہو گا۔''

''وہ خاتون جو میری اتالیق تھیں ان کا سسرالی سلسلہ نسب لکھنو کے ایک میر صاحب سے ملتا تھا۔''

''بکواس......!''

''مادام پونڈری میر کہلاتی ہیں...... ان کے شوہر میر طارق علی اردو کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں۔ اپنی اردو کے لئے میں انہی کا رہین منت ہوں۔ مادام پونڈری میر اکثر کہا کرتی ہیں کہ شوہر کی وجہ سے ان کی مادری زبان چوپٹ ہوگئی ہے اور وہ فرانسیسی بولتے وقت ''نوج...... اوئی اللہ...... اور ہائے میں مرگئی'' وغیرہ کہنے لگی ہیں۔''

''لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر نظر آئی تھی جس کا گلا اس نے فوری طور پر گھونٹ دیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ ''میں تمہیں پھر سمجھاتی ہوں کہ ہماری گڑھی میں قدم بھی نہ رکھنا۔''

''اگر چچا حضور اس قسم کی کوئی پابندی لگائیں تو سر آنکھوں پر۔''

''اچھی بات ہے...... خود بھگتو گے...... یہ زنانہ بندوق جو ساتھ لئے پھرتے ہو کام نہ آئے گی۔ میں نے تھری ناٹ تھری پر نشانے کی مشق کی ہے۔''

''ارے...... وہ چار سو دس بور تو میں لڑکیوں کو خوش کرنے کے لئے ساتھ رکھتا ہوں۔ اتنی چھوٹی سی بندوق دیکھ کر وہ بے قابو ہو جاتی ہیں۔''

''ہونہہ......!'' وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔ ''ہمارے اسلحہ خانے میں بھانت بھانت کی بندوقیں اور رائفلیں ہیں۔''

''میں توپ سے بھی نہیں ڈرتا۔ تم سے شادی کر کے رہوں گا۔''

''بکواس بند۔ میں اس سلسلے میں اب اور کچھ نہیں سننا چاہتی۔''

حمید پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے لڑکی کی باتوں سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہوا ہو۔

کچھ دیر بعد اس نے پائپ کا کش لے کر کہا۔ ''اقتدار الدولہ بہادر مجھے گولی ماردیں گے اگر میں چچا ظفریاب کی حضور پیشی سے پہلے ہی بھاگ نکلا۔''

''تم ابا حضور تک نہیں پہنچ سکو گے۔ ان تک پہنچ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ میری شکست ہوگئی۔''

''کیا میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔''

''میں اب تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔''

''تم اتنی اچھی ہو کہ تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا۔''

''تو پھر......؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔''

''اگر تم سنجیدگی سے سنو تو میں اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''ضرور کہو......میں سنوں گا۔''

''تم ابا حضور کے سامنے پہنچ کر انکار کر سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ تم فرانسیسی لڑکی سے شادی کرو گے۔ دیسی لڑکیوں سے تمہارا نباہ نہیں ہو سکے گا۔''

''تدبیر تو ٹھیک ہے......لیکن یقین کرو اے میری بنت عم......تم پر سے درجنوں فرانسیسی لڑکیاں نثار کی جا سکتی ہیں۔''

اس بار اس نے حمید کو بناوٹی غصے سے گھورا تھا۔ لیکن کچھ بولی نہیں تھی۔ گاڑی کے باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد صدانی واپس آ گیا اور اس نے دونوں ہی پر متحیرانہ نظریں ڈالیں کیونکہ وہ اپنی اپنی برتھ پر سکون سے نیم دراز تھے۔ لڑکی انگریزی کا کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی اور حمید پائپ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔

نصیر آباد کے اسٹیشن پر اترنا تھا۔

رات کے نو بج رہے تھے اور دس منٹ بعد وہ نصیر آباد پہنچنے والے تھے۔ دفعتاً لڑکی نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں اسٹیشن پر رک کر ریل کار کا انتظار کروں گی۔ جس ڈاکٹر کے لئے دارالحکومت گئی تھی وہ میرے بعد ریل کار سے روانہ ہوا ہوگا۔''

''ڈاکٹر......کیوں!''

''ابا حضور کے لئے......وہ علیل ہیں۔''

''تو کیا ہم بھی ٹھہریں گے تمہارے ساتھ۔''

''ہرگز نہیں......تم دوراں نگر جاؤ گے۔ اسٹیشن پر باہر ٹیکسیاں موجود ہوں گی۔''

''لیکن ہم تو تمہارے ساتھ ہی جانا چاہتے ہیں۔''

''نوابزادہ ساجد حمید...... یہ ناممکن ہے۔'' لڑکی نے تلخ لہجے میں کہا۔

''بات بڑھانے کی ضرورت نہیں پرنس۔ وہی کیجئے جو صاحبزادی کہہ رہی ہیں۔'' صمدانی بول پڑا۔

''ہوں ٹھیک ہے۔'' حمید نے کہا اور سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

ٹرین کی رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ لڑکی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگی۔ صمدانی اپنے اور حمید کے سامان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

''دوسری بات۔'' دفعتاً لڑکی ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''اگر کوئی بھی ریسیو کرنے آئے تو ایسے بن جانا جیسے ہم ایک دوسرے کے لئے قطعی اجنبی ہوں۔ اس سے ہرگز نہ کہنا کہ تمہیں بھی دوراں نگر جانا ہے اور تم لوگ کون ہو۔''

''بہت بہتر محترمہ۔'' صمدانی نے بڑے ادب سے کہا۔

ٹرین رک گئی۔ وہ نیچے اُترے۔ دردانہ کو ریسیو کرنے کئی آدمی آئے تھے۔ صمدانی حمید سمیت الگ جا کھڑا ہوا۔

دردانہ ان لوگوں سے کچھ کہہ رہی تھی جو اسے لینے آئے تھے۔ پھر حمید نے انہیں ویٹنگ روم کی طرف جاتے دیکھا۔

''اب کیا خیال ہے جناب صمدانی صاحب۔'' حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا۔

''اب ہمیں باہر چلنا چاہئے جناب عالی...... دوراں نگر یہاں سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ٹیکسیاں اور بسیں چلتی ہیں۔''

''رات اتنی خوشگوار ہے کہ ہم اونٹ گاڑی پر سفر کرنا پسند کریں گے۔''

''اونٹ گاڑیاں تو یہاں نہیں ہوتیں جناب۔''

''لہٰذا پیدل......!''

''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں جناب...... مم...... مطلب یہ کہ پندرہ میل۔''

''ایسی خوبصورت لڑکی کے لئے ہم پندرہ ہزار میل بھی پیدل چل سکتے ہیں۔''

''لل...... لیکن میں بوڑھا آدمی ہوں جناب!''

''کیا تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے۔''

''کک...... کیوں آپ مجھ بوڑھے کا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''محبت کے بغیر ہی پہاڑ سی زندگی گزار آئے ہو۔''

''پرنس مجھ پر رحم کیجئے۔''

''اگر پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تو اب ٹرائی کرو۔''

''واقعی آپ مجھ بوڑھے کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ لیکن یقین کیجئے کہ اقتدار الدولہ بہادر اسے پسند نہیں فرمائیں گے۔ وہ بزرگوں کا ادب کرتے ہیں خواہ وہ انکے خادم ہی کیوں نہ ہوں۔''

اس بار صمدانی کا لہجہ کسی قدر ناخوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دوسرا ہاتھ حمید کے سوٹ کیس کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ حمید نے کہا۔ ''اس حد تک بوڑھوں کا لحاظ ضرور کرتا ہوں کہ انہیں زیادہ وزن نہ اٹھانے دوں۔''

اس نے خود ہی اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور دونوں گیٹ کی طرف بڑھے۔

باہر متعدد ٹیکسیاں موجود تھیں اور ٹیکسی ڈرائیور بالکل تانگے والوں کے سے انداز میں آوازیں لگا رہے تھے۔

حمید نے دیکھا کہ کئی ڈرائیور ان کی طرف جھپٹے ہیں اور جیسے ہی وہ قریب آئے اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اس لمبے تڑنگے ڈرائیور پر اس کی نظر جم گئی۔ جو دونوں ہاتھ بڑھا کر ان دونوں سے سوٹ کیس لے رہا تھا۔

''دد...... دراں نگر...... جج جائیں گے۔'' حمید ہکلایا۔

''بہت بہتر جناب...... میری گاڑی آرام دہ ثابت ہوگی۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا اور وہ دونوں اس کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے ڈگی میں ان کے سوٹ کیس رکھ دیئے اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

حمید گرتا پڑتا ٹیکسی میں داخل ہوا تھا۔ صمدانی ڈرائیور کے برابر اگلی سیٹ پر جا بیٹھا۔

گاڑی چل پڑی اور حمید اپنی پیشانی کا پسینہ خشک کرنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی پشت پر اس کی نظر جمی ہوئی تھی۔ کیونکہ ڈرائیور کی وردی میں یہ کرنل فریدی تھا۔ میک اپ کے بغیر۔

دوسری غراہٹ

حمید کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے فریدی کو میک اپ کے بغیر کسی پیشہ ور ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں دیکھا۔

حالات کچھ بھی رہے ہوں لیکن وہ کوئی اہم معاملہ ہی ہوسکتا تھا جس کی بناء پر فریدی نے اپنے طریق کار میں کسی حد تک تبدیلی کی تھی۔

حمید عجیب سی گھٹن میں مبتلا ہوگیا۔ صدانی کی موجودگی شدت سے کھل رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کون تھا اس کی موجودگی میں فریدی سے گفتگو نہیں کرسکتا تھا۔

دفعتاً اس نے صدانی سے پوچھتے سنا۔ ''دوراں نگر میں کہاں تشریف لے جائیں گے جناب۔''

''قصر دوراں......!''

''اوہو......!''

اس کے بعد اس نے پھر کچھ نہیں پوچھا تھا۔

قصر دوراں ایک قلعہ نما عمارت ثابت ہوئی جس کے عظیم الشان پھاٹک پر دو مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ جیسے ہی ٹیکسی پھاٹک کے قریب پہنچی ایک سنتری رائفل سیدھی کر کے اس کی طرف مڑا۔ ٹیکسی اس سے پہلے ہی رک چکی تھی۔ سنتری قریب آیا۔

''کون......؟'' اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

''ہم خان کے مہمان ہیں۔'' صدانی نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر......!''

''نہیں مہمان......!''

''ہمیں کسی مہمان سے متعلق اطلاع نہیں دی گئی۔''

''خان علیل ہیں......ہم اُن کی عیادت کو آئے ہیں۔''

''ذرا ٹھہریئے......!'' سنتری نے کہا اور پھاٹک کی طرف مڑ گیا۔ پھر وہ اپنے ساتھی سے کچھ کہتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

صدانی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا یہ انتظام۔''

''کیسا انتظام......؟'' حمید نے پوچھا۔

''خان ظفر یاب کی ڈیوڑھی میں لفظ مہمان خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ملازمین بحث نہیں کرتے تھے۔ مہمان کو خاموشی سے مہمان خانے تک پہنچا دیا جاتا تھا۔''

''کس صدی کی بات کر رہے ہیں جناب۔'' حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے جناب۔''

''تب کوئی جوان لڑکی گھر میں نہ رہی ہوگی......کم از کم فرانس میں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

''مجھے تو اب اجازت دیں جناب۔'' فریدی نے صدانی سے کہا۔ ''ٹیکسی اندر نہیں جاسکے گی۔ ان کی اپنی گاڑی آپ کو یہاں سے لے جائے گی۔''

''میاں ایسی بھی کیا جلدی۔'' صدانی بولا۔ ''کم از کم اندر سے جواب تو آ جانے دو۔''

''صاحب میں معافی چاہتا ہوں......کئی بار پہرہ داروں سے تکرار ہو چکی ہے۔''

''اچھی بات ہے بھائی۔'' حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور جیب سے پرس نکال کر میٹر ریڈنگ کی اور کرایہ فریدی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ڈگی سے ان کا سوٹ کیس نکالتے وقت فریدی نے ایک چھوٹا سا پیکٹ حمید کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ حمید نے چپ چاپ اسے جیب میں ڈال لیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس اٹھائے پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے اور ٹیکسی جا چکی تھی۔

''اب مجھے شدت سے بھوک لگ رہی ہے...... جناب صدانی صاحب۔'' حمید بڑبڑایا۔

''میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں ایسے حالات سے دو چار ہونا پڑے گا پرنس۔!''

''کیا حالات دگرگوں ہیں۔''

''خدا جانے......میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔''

دفعتاً وہ سنتری آتا دکھائی دیا جو اندر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔

سنتری پھاٹک پر ہی رک گیا اور دوسرا آدمی بجے تلے قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف بڑھتا چلا آیا۔

''کہیے جناب۔'' اس نے سوال کیا۔

''ہم خان کی عیادت کو آئے ہیں.....اور ہمیں اقتدار الدولہ بہادر نے بھیجا ہے۔''

''اوہ......!'' وہ آدمی غالباً پس و پیش میں پڑ گیا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے کہا۔ ''آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ابھی حاضر ہوا۔''

وہ تیزی سے مڑا اور پھاٹک سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''لاحول ولاقوۃ......!'' حمید بھنا کر بولا۔ ''کم از کم فرانس میں تو ایسا نہیں ہوتا؟''

''یہاں بھی نہیں ہوتا تھا جناب۔''

''تو پھر کیا یہ ہمارے قدموں کی برکت ہے۔'' حمید نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

''قطعی بے دست و پا ہوں جناب۔''

''بے سروپا باتیں نہ کرو...... یہ بتاؤ کہ میں کون سا دولہ ہوں۔''

''ابھی آپ صرف افتخار الدین ہیں۔ اقتدار الدولہ بہادر کے بعد آپ افتخار الدولہ کہلائیں گے۔''

''مزید لاحول ولاقوۃ۔''

''اب آپ تو جی نہ جلایئے۔''

''خبردار جو ایسی باتیں کیں......تم ہی تو مجھے یہاں لائے ہو۔''

''جناب جناب......خدارا مجھے مزید پریشان نہ کیجئے۔''

''لیکن میری بھوک۔''

''کسی بیوہ ماں کی طرح جھنجھلا کر اس وقت یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے کھا لیجئے۔''

حمید کو ہنسی آ گئی اور صمدانی تقدیر کا شکوہ کرنے لگا۔

اتنے میں ایک چھوٹی سی کار اندر سے آتی دکھائی دی۔

وہ ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ ایک خونخوار شکل کا آدمی اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ انہیں گھورتا ہوا غرایا۔ وہ خود گاڑی سے نہیں اُترا تھا۔

حمید کو اسکا انداز جارحانہ لگا لیکن وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول چپ چاپ اندر بیٹھ گیا۔ لیکن جب صمدانی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے قریب بیٹھنے لگا تو اس نے غرا کر کہا۔ ''تم بھی

پیچھے جاؤ۔"

"میں اس کی جرأت نہیں کرسکتا۔"

"کیوں......؟"

لیکن قبل اس کے کہ صمدانی اس "کیوں؟" کا جواب دیتا حمید نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم میرے پاس آجاؤ۔"

"ب...... بہت بہتر جناب۔" صمدانی ہکلاتا ہوا پچھلی سیٹ پر آبیٹھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی پھاٹک سے گزرتی چلی گئی۔

واقعی حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی قلعے میں داخل ہوا ہو۔

چاروں طرف عمارتوں اور باغات کے سلسلے بکھرے ہوئے تھے۔ گاڑی جس سڑک پر جارہی تھی بہت سلیقے سے بنائی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پانی پر تیر رہی ہو۔

جلد ہی اس سفر کا خاتمہ ہوا۔ گاڑی ایک چھوٹی سی خوبصورت عمارت کے سامنے رک گئی تھی۔ ڈرائیور نے عمارت کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مہمان خانہ۔"

حمید اس انداز گفتگو کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ اس نے صمدانی سے اتر چلنے کو کہا۔

"سخت توہین کی جارہی ہے۔" صمدانی کا لہجہ غصیلا تھا۔

وہ دونوں اپنے اپنے سوٹ کیس سنبھالے ہوئے نیچے اُتر گئے۔

"ٹھہرو......!" ڈرائیور غرایا "یہ کارڈ لیتے جاؤ۔"

صمدانی نے مڑ کر کارڈ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا۔

پھر حمید نے اس سے لے کر دیکھا۔ جلی حروف میں اس پر تحریر تھا۔

"مہمان۔ دعا گوئے، دولت واقبال۔"

"حد ہوگئی۔" صمدانی پیر پٹخ کر بولا۔

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ حمید نے صمدانی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دماغ ٹھنڈا رکھو۔"

اس کے بعد وہ عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ صدر دروازے پر انہیں روک کر کارڈ دیکھا گیا۔ صمدانی کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کارڈ دیکھنے والے نے انہیں

اندر پہنچایا۔ کمرہ بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ یہاں دو بستر تھے۔

''آپ دونوں کو اسی کمرے میں قیام کرنا پڑے گا۔ کیونکہ دوسرے کمرے پہلے سے گھرے ہوئے ہیں۔'' ہمراہی نے ان سے کہا۔

''اندازاً کتنے مہمان ہوں گے۔'' حمید نے سوال کیا۔

''آپ کو اس سے کیا سروکار......!'' اس کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔

''آئی ایم سوری۔'' حمید نے معذرت کی۔

''کیا آپ لوگ کھانا کھا چکے ہیں؟''

''نہیں......!''

''اچھا تو پھر دس منٹ بعد آپ کو ڈائننگ روم میں پہنچا دیا جائے گا۔''

''بہت بہتر جناب عالی!'' حمید نے بڑے ادب سے کہا۔

جب وہ آدمی چلا گیا تو صمدانی غصیلے لہجے میں بولا۔ ''آپ کو اپنے رتبے کا خیال رکھنا چاہئے۔''

''پیٹ بھر لینے کے بعد اپنے رتبے کے متعلق سوچوں گا۔'' حمید نے لاپروائی سے کہا اور صمدانی ٹھنڈی سانس لے کر مغموم لہجے میں بولا۔ ''کاش آپ کی تربیت خود اقتدارالدولہ بہادر کے زیرِ نگرانی ہوئی ہوتی۔''

''بس خاموش رہو......ورنہ سچ مچ تمہیں ہی کھا جاؤں گا۔''

دس منٹ بعد ایک باوردی بیرا انہیں ڈائننگ روم میں لے گیا تھا۔

کھانے کے دوران میں حمید محسوس کرتا رہا کہ صمدانی زبردستی حلق سے نوالے اُتار رہا ہے۔

خود اس نے خوب ڈٹ کر معدے کی تواضع کی اور پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے ویٹر سے سوال کیا۔ ''کیا کھانے کے بعد کافی نہیں پیش کی جاتی۔''

''اگر کوئی مہمان فرمائش کرے تو ضرور پیش کی جاتی ہے جناب۔''

''تم بہت شائستہ آدمی ہو......تم سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''خدمت ہی مسلک ہے۔'' ویٹر نے کسی قدر جھک کر کہا۔

''ہم کھانے کے بعد کافی پینے کے عادی ہیں۔''

''ابھی پیش کی جاتی ہے جناب۔'' ویٹر نے کہا اور برتن سمیٹ کر چلا گیا۔

''آپ ان بدبختوں کو منہ نہ لگایئے جناب۔'' صمدانی نے بہت بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''ارے اب تم میری فکر نہ کرو۔ میں عوامی زندگی گزارنے کا عادی ہوں۔ میری تربیت جاگیردارانہ ماحول میں نہیں ہوئی۔''

''اب پھر سے آپ کی تربیت کرنی پڑے گی......ورنہ......!''

''پلیز صمدانی......بس...... مجھے بور نہ کرو۔''

دفعتاً ویٹر نے آ کر اطلاع دی کہ تھوڑی دیر بعد کافی بیڈ روم ہی میں سرو کردی جائے گی۔

وہ بیڈ روم میں واپس آ گئے اور حمید نے باتھ روم کی راہ لی۔ اب اسے اس پیکٹ کا دھیان آیا تھا جو چلتے وقت فریدی نے صمدانی سے چھپا کر اس کے حوالے کیا تھا۔

باتھ روم میں پہنچ کر اس نے پیکٹ نکالا اور اُسے کھولنے لگا۔

''اوہ......!'' اس نے طویل سانس لی۔ یہ ایک چھوٹا سا جیبی ٹرانسمیٹر تھا۔ شکل سگریٹ لائٹر کی سی تھی اس کے ساتھ ہی ایک تحریر بھی تھی۔

''تم جس وقت چاہو اس ٹرانسمیٹر پر مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو......اور بہتر یہی ہوگا کہ خود ہی کرید کرید کر اس بوڑھے آدمی سے ان حالات سے متعلق معلومات حاصل کرو جس سے اس وقت دوچار ہو۔''

حمید نے اس پرچے کو نذرِ آتش کر دینے کے بعد ٹرانسمیٹر کو جیب میں ڈال لیا اور بیڈ روم میں واپس آ گیا۔

صمدانی آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ حمید کی آہٹ پر چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

حمید بستر پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''ہم چچا حضور کی خدمت میں کب پیش کئے جائیں گے۔''

''کیا عرض کروں جناب! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا......ان حالات کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔''

''صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے......ابا حضور نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ مجھ سے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں ایک آدمی مجھے ملے گا جس کے ساتھ مجھے سفر کرنا ہے۔''

''غالباً اقتدار الدولہ بہادر کو پہلے ہی شبہ تھا کہ کہیں آپ انکار نہ کردیں۔'' صمدانی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''اگر میرا مشورہ شامل حال ہوتا تو آپ کبھی فرانس نہ جاسکتے۔ آپ کی تعلیم وتربیت یہیں ہوتی۔''

''مجھے الجھن میں نہ ڈالو پیارے صمدانی...... بتاؤ کہ کس قسم کے حالات سے میرا سابقہ ہے۔ لاعلمی میں کہیں کوئی ٹھوکر نہ کھاؤں۔''

''مناسب ہے......ضروری بھی ہے کہ آپ کو حالات سے آگاہ کردیا جائے۔''

''اور اب تم اسی طرح آرام سے لیٹ جاؤ جیسے پہلے لیٹے ہوئے تھے۔ حفظ مراتب کا خیال ترک کردو، ورنہ دونوں ہی تکلیف اٹھائیں گے۔''

''بہت بہت شکریہ جناب! بڑھاپا بُری چیز ہے۔'' صمدانی نے کہا اور آرام کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر بولا۔ ''اعتماد الدولہ اور خان دوراں جڑواں بھائی تھے۔ دونوں کے درمیان بے انتہا محبت تھی۔ ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ یہ قلعہ ان کی آبائی جائے رہائش تھی۔ اس زمانے میں اعتماد الدولہ صرف اعتماد الدین تھے اور خان دوراں عباد الدین کہلاتے تھے۔ اس وقت ان دونوں کے باپ خان دوراں کہلاتے تھے۔ کیونکہ یہ خاندانی خطاب شیر شاہ سوری کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ دونوں بھائیوں کو شکار کا بے حد شوق تھا۔ خصوصیت سے بھیڑیوں کا شکار ان کی مرغوب ترین تفریح تھی۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے اور ان کے پیچھے بے شمار شکاری کتے شور مچاتے ہوئے چلتے۔ میں نے اپنے باپ سے سنا تھا کہ دوسری جاگیروں میں یہ دونوں دو دیوانوں کے نام سے مشہور تھے۔ ٹکر کے لوگ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ بہرحال اس چپقلش کی کہانی بھیڑیے کے شکار ہی سے شروع ہوئی ہے۔ ایک بار یہ دونوں جھنڈ سے بچھڑے ہوئے ایک بھیڑیے کے تعاقب میں تھے، جو ان کے کئی کتوں کو زخمی کرچکا تھا۔ اعتماد الدولہ کا کہنا تھا کہ اسے کتوں ہی سے زیر کرایا جائے اور خان دوراں کو ضد تھی کہ جیسے ہی وہ نظر پڑا وہ اسے رائفل کا نشانہ بنادیں گے۔ بات اتنی بڑھی کہ دونوں نے ایک دوسرے پر رائفلیں تان لیں کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا بھی نہیں تھا۔ اسی دوران میں بھیڑیا بھی جھاڑیوں میں نظر آگیا اور خان دوراں نے اپنی رائفل کا رخ اس کی

طرف کر کے فائر کر دیا۔ گولی نشانے پر بیٹھی تھی۔ اعتماد الدولہ نے خان دوراں پر فائر کر دیا۔ گولی اتفاقاً گھوڑے کے سر پر لگی۔ اس طرح خان دوراں نے اپنا بچاؤ کر لیا۔ دونوں نے جھاڑیوں میں پوزیشن لے لی تھی اور اس وقت تک ایک دوسرے پر فائر کرتے رہے تھے جب تک کارتوس ختم نہیں ہو گئے تھے۔

اس کے بعد شائد دونوں ہی کو ہوش آیا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے منہ چھپائے ہوئے جنگلوں میں بھٹکتے پھرے تھے۔ اعتماد الدولہ نے پھر کبھی اس گڑھی کی صورت نہ دیکھی، جو آج قصر دوراں کہلاتی ہے۔ وہ کافی عرصہ تک ادھر اُدھر بھٹکتے رہنے کے بعد ایک بڑی ریاست میں جا پہنچے تھے۔ وہاں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک بڑے عہدے پر فائز ہوئے اور باپ کی زندگی ہی میں خطاب یافتہ ہو گئے۔ اعتماد الدولہ کہلائے۔ یہ اس ریاست کا سب سے بڑا اعزاز تھا اور صرف شاہی خاندان کے افراد ہی تک محدود تھا۔ ان دونوں کے باپ خان دوراں نے اپنی زندگی میں بڑی کوشش کی تھی کہ دونوں بھائی مل جائیں لیکن اعتماد الدولہ نے تو انہیں بھی شکل دکھانے سے انکار کر دیا تھا۔ معذرت طلب کی تھی۔ خان دوراں یعنی ان کے باپ نے ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے اس مطالبے کو دہرانا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگائی تھی کہ خواہ دونوں بھائی زندگی بھر ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھیں لیکن وہ اپنے بچوں کی شادیاں آپس ہی میں کریں گے۔ باہر اسی صورت میں کر سکیں گے جب دونوں بھائیوں کی اولاد میں جوڑ نہ ملے۔ لہٰذا تمہارے والد اقتدار الدولہ کی شادی تمہارے چچا، جو باپ کے مرنے کے بعد خان دوراں کہلائے تھے ان کی بیٹی سے ہوئی۔ تمہارے دادا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے خان ظفر یاب کی شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی۔ اب یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ تم اپنے باپ کی واحد اولاد ہو اور خان ظفر یاب کے بھی صرف ایک ہی بیٹی ہے۔''

صمدانی خاموش ہو گیا اور حمید پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اتنے میں کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔

''آجاؤ۔'' حمید نے بلند آواز میں کہا اور ویٹر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

جب وہ کافی کی ٹرے رکھ کر واپس جانے لگا تو حمید نے اسے دس کا ایک نوٹ دیتے

ہوئے کہا۔ ''تم بہت باسلیقہ آدمی ہو۔''

''شکریہ جناب۔'' اس نے نوٹ وصول کر کے حمید کو تعظیم دی اور باہر چلا گیا۔

''اور اب......!'' صمدانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں اسی لئے تمہیں یہاں لایا ہوں کہ تمہاری شادی ظفریاب کی بیٹی سے ہو سکے۔ مجھے معاف کرنا میں تمہیں تم کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جاگیردارانہ نظام والی تہذیب کو تہہ کر رکھو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''ہوں......اوں......لیکن کیا تم اس بدتمیز لڑکی سے نباہ کر سکو گے۔''

''بدتمیزوں کو باتمیز بنانا میری ہوبی ہے۔ ٹھہرو...... تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہارے لئے کافی بناؤں گا۔''

''بہت بہت شکریہ...... میں بہت تھک گیا ہوں پرنس! اور یہاں کے لوگوں کے اطوار نے میرے اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔''

''فکر نہ کرو...... ہر تکلیف کا ازالہ ہو جائے گا۔'' حمید نے کہا اور اٹھ کر کافی بنانے لگا۔

صمدانی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''کاش میں کسی ذریعہ سے اقتدار الدولہ بہادر کو یہاں کے حالات سے آگاہ کر سکتا! میں نہیں چاہتا کہ مجھ پر کسی قسم کا الزام آئے۔''

''میں کہتا ہوں ہر اندیشے کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔ پورے حالات کا علم ہو جانے کے بعد سب کچھ مجھے کرنا ہے۔''

''تو پھر میں بری الذمہ۔''

''قطعی......!'' حمید نے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم کافی پی کر سونے کی کوشش کرو۔''

اس کے بعد پھر کسی قسم کی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور کافی ختم کر کے صمدانی بستر پر جا لیٹا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد حمید نے اس کے خراٹے سنے۔

وہ فریدی سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ صمدانی بے خبر سو رہا ہے وہ پھر باتھ روم میں داخل ہوا اور عقبی کھڑکی کھول کر ایسی پوزیشن

میں آ گیا کہ باہر سے دیکھا نہ جا سکے۔ پھر جیب سے ٹرانسمیٹر نکال کر اس کا سوئچ آن کیا اور ہلکی آواز میں فریدی کو پکارنے لگا۔

''ہیلو...... ہارڈ اسٹون...... ہارڈ اسٹون......!''

''اٹ از ہارڈ اسٹون......!''

''میں نے بوڑھے سے ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق ہمارے ساتھ یہاں سرد مہری کا برتاؤ ہوا ہے۔ اس مہمان خانے میں ہمیں جگہ ملی ہے جہاں دولت واقبال کے دعا گو ٹھہرائے جاتے ہیں......اوور......!''

''صبر سے کام لو......تمہارے لئے دلچسپیاں ہوں گی......اوور......''

اس کے بعد حمید نے اسے بتایا کہ کس طرح اتفاقاً لڑکی سے ٹرین ہی میں ملاقات ہوگئی تھی۔

''اچھی علامت ہے......!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ویسے وہ ابھی تک ریلوے اسٹیشن ہی پر ریل کار کی منتظر ہے۔ اگر تم اسی وقت خان تک پہنچنا چاہتے ہو تو باہر نکلو اور مہمان خانے سے بائیں جانب چل پڑو۔ قریباً دو سو قدم کے فاصلے پر داہنی جانب ایک اور راستہ ملے گا جس کا اختتام ایک چھوٹے سے پارک پر ہوا ہے۔ پارک کے پھاٹک پر جو آدمی ملے اس سے اتنا کہہ دینا کہ تم مہمان ہو......وہ تمہارے لئے کوئی تدبیر کر دے گا۔ ذرا ٹھہرو...... ہاں......تم آدھے گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہو سکتے ہو......اوور......!''

''کیا میرا ہونے والا خسر بہت زیادہ بیمار ہے......اوور......!''

''خفقان کا مریض ہے...... وہ لوگ اسے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ تم اگر کسی طرح اس تک پہنچ سکو تو بہتر ہے......اوور اینڈ آل......!''

دوسری طرف سے آواز آنی بند ہوگئی اور حمید نے طویل سانس لیکر سوئچ آف کر دیا۔

کمرے میں واپس آ کر اس نے لباس تبدیل کیا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد مہمان خانے سے نکل ہی رہا تھا کہ دربان نے اُسے ٹوکا۔

''پیٹ میں کچھ گرانی سی محسوس کر رہا ہوں اسلئے کچھ دیر ٹہلنے کا ارادہ ہے۔'' حمید بولا۔

''کیا آپ کے پاس رات کو باہر نکلنے کا اجازت نامہ ہے۔''

''ہے تو بھائی......لیکن میرے ساتھی کے پاس ہے اور وہ بے خبر سو رہا ہے۔''

''تب تو مجھے افسوس ہے جناب۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔مہمان پر اس قسم کی پابندی آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔''

''آپ براہِ کرم اندر تشریف لے جایئے۔'' دربان نے سخت لہجہ میں کہا۔صورت سے اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

''اچھا میرے مہربان دوست۔'' حمید نے ٹھنڈی سانس لی اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر دس منٹ بعد ٹرانسمیٹر پر فریدی سے رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

آخر تھک ہار کر اس نے لباس تبدیل کیا اور سونے کیلئے لیٹ گیا تھا۔ دن بھر کی تھکن غنودگی کی گود میں جا لیٹی لیکن نیند کے غلبے سے قبل ہی کسی نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔

وہ اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر اونچی آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

جواب میں غراہٹ سنائی دی۔ یقیناً وہ کسی خونخوار بھیڑیئے کی غراہٹ تھی۔

باپ اور بیٹا

غراہٹ ہی کے ساتھ لوگوں کی چیخیں بھی سنائی دینے لگیں۔شور اتنا بڑھا کہ صدانی کی نیند بھی اُچٹ گئی۔

حمید کو نہایت آرام سے آرام کرسی پر نیم دراز دیکھ کر بولا۔''آپ نے شاید یہ بھی معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ معاملہ کیا ہے۔''

''کچھ بھی ہو ہمارے آرام میں خلل پڑا ہے......ہم ان نالائقوں کو ہرگز معاف نہ کرسکیں گے۔''

''میں گذارش کرر ہاہوں کہ باہر نکل کر دیکھئے تو کیا معاملہ ہے۔''

''آپ خود ہی تکلیف فرمائیے۔'' حمید نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اللہ میرے بڑھاپے پر رحم کرے۔''

حمید نے سوٹ کیس سے چار سو دس بور کی دو نالی بندوق نکالی اور کارتوسوں کی پیٹی گلے میں ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پھر کسی نے دروازہ پیٹا۔

اب نہ بھیڑیئے کی غراہٹ سنائی دی تھی اور نہ کوئی چیخ۔

''کون ہے؟'' حمید نے دروازے کے قریب پہنچ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

''دروازہ کھولئے جناب۔'' باہر سے سہمی ہوئی سی آواز آئی۔ یہ اسی شریف النفس ویٹر کی آواز تھی جسے حمید نے دس روپے ٹپ کئے تھے۔

اس نے جلدی سے بندوق سلیپنگ پاجامے میں اڑس کر اوپر سے قمیض چھوڑ دی اور کارتوسوں کی پیٹی پلنگ کے نیچے ڈال کر دروازہ کھولا۔

ویٹر بوکھلائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوا اور خود ہی اس طرح دروازہ بند کرنے لگا جیسے ملک الموت تعاقب میں ہو۔ پھر مڑ کر ہکلایا۔''آپ......لل......لوگ بخیریت ہیں نا۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' حمید نے اس کا بازو پکڑ کر آرام کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔''تم بہت زیادہ پریشان معلوم ہوتے ہو۔ ذرا دم لے لو۔''

ویٹر بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ حمید کھڑا رہا۔ بندوق کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

''کیا قصہ تھا۔'' صمدانی نے ویٹر کو مخاطب کیا۔

''خاموش رہو......اسے دم لینے دو۔'' حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔

دو تین منٹ تک گہری خاموشی رہی پھر ویٹر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔''اس مہمان خانے پر پہلی بار اس کا حملہ ہوا تھا۔ میرے خدا کتنا بھیانک تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار بھیڑیا دیکھا۔''

''بھیڑیا......!'' حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جناب عالی! کیا آپ نے آواز نہیں سنی تھی۔''

''میں سمجھا تھا شائد کوئی لڑکی ہے۔''

''لڑکی......!'' ویٹر کی خوفزدگی حیرت میں تبدیل ہوگئی۔

''ہاں ہاں...... ہماری طرف لڑکیاں اس طرح غراتی ہیں۔''

''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب۔''

''پہاڑوں کے دیس سے جہاں کی لڑکیاں بھیڑیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔''

''وہ بھیڑیا ہی تھا جناب۔ منحوس بھیڑیا۔ جو ایک سو سال سے اس خاندان پر مسلط ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

لیکن ویٹر حمید کے سوال کا جواب دینے کی بجائے خود کلامی میں مبتلا نظر آیا۔

''لیکن اس نے مہمان خانے کا رخ کیوں کیا......وہ تو صرف محل سرا میں دیکھا جاتا تھا۔''

''میرے دوست تم مجھے الجھن میں مبتلا کر رہے ہو۔''

''جی......!'' ویٹر چونک پڑا۔

''پردیسیوں سے ادھوری باتیں نہیں کی جاتیں۔''

''صاحب یہ ایک لمبی کہانی ہے۔''

''کچھ بھی ہو میں ضرور سنوں گا۔''

اور پھر ویٹر نے اعتماد الدولہ اور خان دوراں کی کہانی شروع کر دی۔

حمید پائپ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ وہ اب بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔

وہ کہانی ختم کر چکا تو صمدانی نے کہا۔ ''میں نے پہلے تو کبھی یہ نہیں سنا کہ قصر دوراں میں کوئی بھیڑیا دکھائی دیا ہو۔''

''پچھلے سال تک یہ بات ڈھکی چھپی رہی تھی جناب! لیکن جب محل کے باہر کا ایک آدمی اس کا شکار ہوا تو سب کو معلوم ہو گیا۔''

''ہوں......تو تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ وہی بھیڑیا ہے جسے خان دوراں نے گولی ماری تھی۔'' حمید نے پوچھا۔

''صرف میرا نہیں سب کا یہی خیال ہے جناب...... ویسے محل سرا والے اس کی تردید ہی کرتے رہتے ہیں۔''

''خیر ہوگا...... یہ بتاؤ یہاں بھیڑیئے نے کسی کو زخمی تو نہیں کیا۔''

''بس باورچی بال بال بچ گیا۔ وہ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے اندر داخل ہوا تھا اور ادھر ہی سے بھاگ بھی گیا۔''

''چلو...... میں دیکھوں گا۔''

''نہیں جناب۔ مجھے یہیں رہنے دیجئے جب تک محل سرا سے کوئی یہاں نہ پہنچ جائے۔ فون کیا گیا ہے۔''

''اوہو...... کیا یہاں فون بھی موجود ہے۔''

''اس چھوٹے سے قلعے میں کیا نہیں ہے جناب! خان نے اسے ایک چھوٹا سا شہر بنا دیا ہے۔''

حمید نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ انہیں وہیں چھوڑ کر باتھ روم میں داخل ہوا اور بندوق کاسمیٹکس کی الماری میں چھپا دی۔

رات کے دو بجے تھے۔ اس نے سوچا ضروری نہیں کہ اس وقت بھی ٹرانسمیٹر کے ذریعہ فریدی سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔ وہ پھر کمرے میں واپس آ گیا اور اب اس فکر میں تھا کہ ویٹر کی نظر بچا کر کسی طرح کارتوسوں کی پیٹی بھی مسہری کے نیچے سے نکال لے۔

دفعتاً کسی پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

''کک...... کیا یہاں پولیس بھی ہے۔'' صمدانی نے ویٹر سے پوچھا۔

''خان کی اسپیشل پولیس جس کے سربراہ ان کے بھتیجے سردار ضیغم ہیں۔''

''خان کے بھتیجے۔'' صمدانی اچھل پڑا۔ ''لل...... لیکن انکے تو کوئی دوسرا بھائی نہیں ہے۔''

''بیوی کے بھتیجے کو آپ کیا کہیں گے۔ جناب سردار ضیغم خود ہی تشریف لائے ہوں گے۔ وہ خود ہی ہر معاملے کو دیکھتے ہیں۔ اب مجھے باہر نکلنا چاہئے۔''

''ضرور...... ضرور......!'' حمید بستر سے اٹھتا ہوا بولا۔ اس نے ویٹر کو باہر نکال کر دروازہ بولٹ کر دیا۔

باتھ روم سے بندوق لا کر کارتوسوں کی پیٹی سمیت سوٹ کیس میں رکھ دی اور ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑ کر لیٹ گیا۔

''پتہ نہیں ہم کس مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔'' صمدانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''لیٹ جاؤ...... لیٹ جاؤ...... دیکھا جائے گا۔'' حمید نے کہا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرلیں۔

پھر شاید قریباً دس منٹ بعد کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔

''کون ہے......؟'' حمید جھلا کر چیخا۔

''دروازہ کھولو۔'' گونج دار آواز اور سخت لہجے میں کہا گیا۔

حمید نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک قد آور نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر چیتے کی کھال کے سے کپڑے کی قمیض اور سیاہ پتلون تھی۔ بھاری جبڑے سفاک طبیعت کی غمازی کررہے تھے۔ آنکھوں میں سرخی کے ساتھ ساتھ وحشت بھی تھی۔

اس کے پیچھے دو مسلح آدمی کھڑے تھے۔

''تم لوگ کہاں سے آئے ہو۔'' اس نے حمید کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''دارالحکومت سے۔''

''کیوں آئے ہو......؟''

''بتاؤ......!'' حمید نے صمدانی کو للکارا۔

صمدانی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے آیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہمیں اقتدار الدولہ بہادر نے بھیجا ہے۔''

''اوہو......اچھا......!''

''یہ پرنس افتخار ہیں۔''

''اوہ......ہیلو......!'' اس نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے حمید سے مصافحہ کیا۔

یقیناً وہ خاصا طاقتور آدمی تھا۔ حمید نے محسوس کیا۔

''لیکن......آپ لوگ یہاں کیسے......کیا آپ نے افسر مہمانداری کو نہیں بتایا تھا کہ آپ کون ہیں؟''

''یہ تو نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا کہا تھا کہ ہمیں اقتدار الدولہ بہادر نے خان کی عیادت کو بھیجا ہے۔''

''تب تو اس بیچارے کا کوئی قصور نہیں......اب آپ دونوں حضرات براہِ کرم میرے

ساتھ چلئے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے شایان شان استقبال نہ ہو سکا۔''

''کوئی بات نہیں......کوئی بات نہیں۔'' حمید نے کہا اب وہ خالص فرانسیسی انداز میں اردو بول رہا تھا۔

دونوں مسلح آدمیوں نے ان کا سامان اٹھایا اور وہاں سے چل پڑے۔

''چچا حضور کی اب کیسی طبیعت ہے۔'' حمید نے سردار ضیغم سے پوچھا۔

''اس وقت ایک ڈاکٹر دارالحکومت سے آیا ہے۔ صبح ہی معلوم ہو سکے گا کہ اب کیسی طبیعت ہے۔ وہ ڈاکٹر کے علاوہ اور کسی کو اپنے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ دیکھ بھال کے لئے تین نرسیں ہیں اور دو فیملی ڈاکٹر۔''

''مرض کیا ہے جناب۔'' صمدانی نے پوچھا۔

''ابھی تک مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی۔''

وہ کار میں بیٹھ گئے جسے ضیغم ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ دونوں مسلح آدمی وہیں رہ گئے۔

حمید ضیغم کے برابر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

''آخر یہ کیسا ہنگامہ تھا موسیو زیگم......!'' اس نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

''کہیں سے ایک بھیڑیا آ گیا ہے۔''

''بھیڑیا کیا......؟''

''وولف......وولف......میں نہیں جانتا کہ اسے فرانسیسی میں کیا کہتے ہیں۔''

''وولف میں سمجھتا ہوں......بائی گاد......میں اس کا شکار کروں گا۔''

''اوہو......شکاری بھی ہیں آپ۔''

''ہاں......مجھ کو شکار کا شوک ہے۔''

''آپ اردو قریب قریب خاصی بول سکتے ہیں۔''

''ہاں......میری گورنس کا میاں لکھنوی تھا۔''

''بہت خوب......!''

گاڑی اب ایک بڑی عمارت کے سامنے رکی تھی۔

''یہ خصوصی مہمان خانہ ہے......معززین کے لئے۔'' سردار ضیغم نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ جناب عالی!'' صمدانی گڑگڑایا۔ ''مجھے جناب والا کی خوش اخلاقی نے بے حد متاثر کیا ہے۔''

''میں اس نمک خوار کا بیٹا ہوں جو اقتدار الدولہ بہادر کو خان دوراں کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لایا۔''

''اوہ......اچھا اچھا......!'' سردار ضیغم نے پُرمعنی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔

''مگر یہ بھیڑیا جناب عالی!''

''آپ لوگ فی الحال اندر چلئے۔ یہ ہمارا دردسر ہے۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ عنقریب اسے ختم کردیا جائے گا۔''

''مجھے نہ بھولئے گا موسیو۔ اس کے شکار پر مجھے بھی ساتھ لے چلئے گا۔''

''ضرور......ضرور......!'' لہجہ طنزیہ تھا۔

وہ اندر آئے اور اس بار وہیں کے دربان نے ان کے سوٹ کیس اٹھائے تھے۔

''کیا یہاں اور بھی مہمان ہیں۔'' حمید نے سردار ضیغم سے پوچھا۔

''نہیں......!''

''تب تو ہم وہیں بہتر تھے۔ یہاں تنہائی میں......!''

''آپ کی تنہائی رفع کردی جائے گی۔'' خان ضیغم نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دیجئے۔ صبح ملاقات ہوگی۔''

سردار ضیغم کے چلے جانے کے بعد صمدانی نے کہا۔ ''یہ جگہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جناب عالی......مجھ پر ایک کرم فرمائیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سوئیں گے۔''

''کیوں......؟''

''ایسے حالات میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''کیا مطلب......؟''

''آخر بھیڑیا ہی کیوں؟ شیر، چیتا، یا ریچھ کیوں نہیں۔ ان اطراف کے جنگلوں میں ان

کی بھی کمی نہیں۔''

حمید نے اس پر مزید بات نہیں بڑھائی تھی اور وہ ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔

دوسری صبح بھاری بھرکم ناشتے سے سابقہ پڑا۔ یہاں کے ملازمین ان کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔

قریباً دس بجے سردار ضیغم پھر دکھائی دیا۔ پرتپاک انداز میں حمید سے ملا اور بولا۔ ''عجیب بات ہے کہ پھوپھی حضور اور بے بی خان آپ لوگوں سے ملنے پر رضا مند نہیں۔''

''خدارا آپ اپنا تعارف بھی تو کرائیے۔'' صمدانی نے کہا۔

''میں خان ظفریاب کا بھتیجا سردار ضیغم ہوں۔''

''مطلب یہ کہ چچی حضور کے بھتیجے۔'' حمید نے پوچھا۔

''جی ہاں......!''

''میں چچا حضور سے ملنے آیا ہوں۔''

''ان پر تین بجے شب سے غشی طاری ہے۔''

''ہوش میں آنے کا انتظار کیا جائے گا۔'' حمید نے لاپروائی سے کہا۔

''یہاں مہمانوں سے یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ اب تشریف لے جائیں۔ جب تک آپ لوگوں کا دل چاہے قیام کیجئے۔''

''اوہ......اچھا......!'' حمید نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''یہ بے بی کان کون ہیں۔''

اس پر ضیغم نے قہقہہ لگایا اور حمید کو آنکھ مار کر صمدانی کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیا۔

''ہم نہیں سمجھے جناب عالیٰ!''

''جن کے لئے آپ چچا حضور کی خدمت میں پیش ہونے آئے ہیں۔ ان کا نام دردانہ ہے لیکن محل میں بے بی خان کہلاتی ہیں۔''

''اور وہ مجھ سے نہیں ملیں گی۔'' حمید نے بے بسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ان کا خیال تو یہی ہے۔''

''آپ اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کرسکتے۔''

''بھلا میں ان لوگوں کو کس طرح آمادہ کرسکوں گا۔''

''کوئی بات نہیں......کوئی بات نہیں......لیکن وہ بھیڑیئے کا شکار۔''

''اس میں آپ ضرور شریک ہوں گے۔''

''بس کافی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ کچھ دیر بعد آپ کی تنہائی رفع ہو جائے گی۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دیجئے۔''

''نہیں کچھ نہیں......شکریہ۔''

وہ چلا گیا اور صمدانی بے حال ہو کر آرام کرسی پر گر گیا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے بھائی......شادی میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔'' حمید نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔

''اس سے بڑی توہین اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ بہو بیگم آپ سے ملنے سے انکار کر دیں۔''

''یہ بہو بیگم کیا چیز ہے۔''

''آپ کی چچی حضور......!''

''میں چچا حضور سے ملنے آیا ہوں۔''

''یہ لوگ ہرگز نہیں ملنے دیں گے......میں سمجھ گیا۔ صاحبزادی کو ماں کی حمایت حاصل ہے۔ پرنس یہ بہت بُرا ہوا۔ بہت بُرا۔''

''فرانس میں میری تین چار محبوبائیں ہیں......تم بالکل فکر نہ کرو۔''

''آپ نہیں سمجھ سکتے ان معاملات کو۔''

''میں صرف ایک ہی معاملہ سمجھتا ہوں۔ شادی کے سلسلے میں بس خاموشی......میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ کسی دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔''

صمدانی کو کمرے سے نکال کر اس نے دروازہ بند کیا اور عقبی باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب پہنچ کر جیب سے ٹرانسمیٹر نکالا۔ فریدی سے فوری طور پر رابطہ قائم ہوا تھا۔

حمید نے اسے پچھلی رات سے لے کر اب تک کی داستان سنائی اور بولا۔ ''اس بار تو بالکل ہی اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے......اور......!''

''کب تک میری انگلی پکڑ کر چلتے رہو گے...... خیر اب یہ معلوم کرو کہ اس عمارت سے باہر نکلنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس کے بعد پھر مجھے کال کرنا۔ پھر کوئی مشورہ دے سکوں گا! اوور اینڈ آل......!''

حمید نے پھر ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔ لباس تبدیل کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ جس نے آدھی آستین کی سفید قمیض اور براؤن رنگ کی جین پہن رکھی تھی۔ بڑی اسمارٹ اور دلکش تھی۔

''پرنس افتخار پلیز......!'' اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

''ہاں...... ہاں......!''

''کیا آپ باہر جا رہے ہیں۔''

''ارادہ تو یہی ہے۔''

''مجھے سردار ضیغم نے بھیجا ہے تاکہ آپ تنہائی محسوس نہ کر سکیں۔''

''اپنے ملک میں یہ پہلا اچھا آدمی ملا ہے۔'' حمید مسکرایا۔

''چلئے! میں آپ کو قلعہ کی سیر کراؤں گی۔''

''ابھی آپ بیٹھئے...... میں باتھ روم تک جانا چاہتا ہوں۔''

حمید نے کہا اور اس کے ساتھ سٹنگ روم تک آیا اور پھر اپنے بیڈ روم میں واپس آ کر دوبارہ فریدی سے رابطہ قائم کیا۔ نئی سچویشن کا ذکر کرتے ہوئے مشورہ مانگا۔

''مزے کرو...... ہر جگہ تمہاری نامعقول طبیعت کے بہلنے کا سامان ہو جاتا ہے۔ ضرور سیر کرو قلعے کی۔ اوور اینڈ آل......!''

''بہت اچھا سرکار۔'' حمید نے بڑبڑاتے ہوئے ٹرانسمیٹر جیب میں ڈالا اور سٹنگ روم میں واپس آ گیا۔ لڑکی چھوٹا سا آئینہ ہاتھ میں لئے اپنا میک اپ درست کر رہی تھی۔ حمید اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''آپ کا لہجہ بہت پیارا ہے۔'' وہ آئینے کو وینٹی بیگ میں ڈالتی ہوئی بولی۔

''شکریہ......!''

''میں نے سنا ہے کہ آپ کی پرورش فرانس میں ہوئی ہے۔''

''ہاں ماموزئیل......!''

''اللہ......کتنا پیارا......!''

حمید مسکراتا رہا۔ وہ باہر نکلے۔ روش پر سرخ رنگ کی اسپورٹ کار نظر آئی۔

''آپ ڈرائیو کریں گے۔'' لڑکی نے ہنس کر پوچھا۔

''ماموزئیل کی مرضی۔''

''میرا نام رخشی ہے۔''

''رکشی......بہت پیارا نام ہے۔''

''ہائے رکشی کہہ کر تو آپ نے اسے اور بھی پیارا کر دیا۔''

حمید نے اگنیشن کی اس سے لے کر انجن اسٹارٹ کیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھی پکے آم کی طرح مہک رہی تھی۔ حمید نے ذہن میں یہی تشبیہ آئی۔ ورنہ اس نے تو ایودی کولون میں خود کو بسا رکھا تھا۔

جیسے ہی کار پھاٹک سے نکلنے لگی ایک دوسری لمبی سی کار نے اس کا راستہ روک لیا جس پر ایک جغادری قسم کا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے حمید کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ خود اس کی گاڑی بھی رک گئی تھی۔ ڈرائیور نے اُتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بڑے ٹھسے سے نیچے اُترا تھا۔ عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ لیکن قویٰ مضبوط تھے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عجیب سی مکارانہ چمک تھی۔

اسپورٹ کار کے قریب پہنچ کر اس نے غرائی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ ''تم اقتدار کے بیٹے ہو۔''

''ہاں میں اکتدار الدولہ کا بیٹا ہوں اور ان کے بعد اقتکار الدولہ کہلاؤں گا۔''

''تم خصوصی اجازت نامے کے بغیر مہمان خانے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ واپس جاؤ۔''

لڑکی آہستہ سے بولی۔ ''واپس چلئے پرنس...... یہ سردار ضیغم کے باپ سردار قاہر ہیں۔ خدارا......واپس چلئے......واپس چلئے۔''

حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال دیا۔

چور

عمارت کے اندر پہنچ کر لڑکی نے کہا۔ ''مجھے بے حد افسوس ہے پرنس۔''

''افسوس تو مجھے بھی ہے لیکن......!''

''لیکن کیا......؟''

''مجھے بالکل افسوس نہ ہونا چاہئے۔ تم اتنی کوبصورت ہو کہ میں تمہاری آنکھوں میں ساری دنیا دیکھ سکتا ہوں۔''

''ہائے اللہ کوبصورت...... ہائے پرنس......کتنا پیارا لفظ۔''

''یہ بوڑھا ناراض کیوں ہو رہا تھا۔''

''مجھے خود بھی حیرت ہے......آپ کے ساتھ یہ سلوک میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔''

''بہت کوفناک تھا۔''

''ہاں پرنس......وہ بہت خوفناک ہے۔ بیچارے خان تو ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ قلعے پر اس کی حکومت ہے۔ سردار ضیغم جو اس کا بیٹا ہے اسے بالکل پسند نہیں کرتا۔''

''تو یہ بے بی کان کاموں ہے۔''

''ہاں...... پرنس......!''

''اچھا......اچھا......ذرا میں باتھ روم تک جاؤں گا۔''

''کتنی بار جاؤ گے باتھ روم میں۔''

''نروس ہوتا ہوں تو بار بار ضرورت پیش آتی ہے۔''

''تم نروس کیوں ہو پرنس......!''

''اتنی کوبصورت لڑکی سامنے ہو تو نروس ہونا ہی پڑے گا۔''

اسے ڈرائینگ روم میں چھوڑ کر وہ پھر سونے کے کمرے میں آیا اور ٹرانسمیٹر پر فریدی سے رابطہ قائم کر کے موجودہ سچویشن بتائی۔

''لڑکی رات کو وہاں نہ رہنے پائے......اوور......!'' فریدی کی آواز آئی۔

''اگر وہ اس پر اڑ گئی تو۔''

''احمق......کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکے گا کہ اسے کسی طرح ٹال دو۔''

''آپ مجھے احمق ہی رہنے دیجئے۔''

''حمید سنجیدہ ہو جاؤ......یہ ضروری ہے۔''

''بہت بہتر جناب۔'' حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اوور......اینڈ آل......!''

ڈرائینگ روم سے واپس آ کر اس نے دیکھا کہ سردار قاہر جس نے اسے باہر جانے سے روکا تھا لڑکی پر برس رہا ہے۔

''تجھے جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی......کتیا کہیں کی۔''

''مم......مجھے سردار ضیغم نے بھیجا تھا۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے بُری طرح کانپ رہی تھی۔

''شریف آدمی۔'' حمید بے حد نرم لہجے میں بولا۔ ''اس پھول کو شبنم چاہئے۔ آگ برسانے والا سورج نہیں۔''

''تم خاموش رہو۔'' سردار قاہر اس پر الٹ پڑا۔

''کسی سہمی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر میں کاموش نہیں رہ سکتا۔ میں ایک اداس تنہا آدمی ہوں۔ اس لڑکی کو یہیں میرے پاس رہنے دو۔''

''میں کہتا ہوں خاموش رہو۔'' سردار قاہر پیر پٹخ کر بولا۔

اتنے میں صدانی دکھائی دیا۔ وہ دروازے میں کھڑا سردار قاہر کو گھورے جا رہا تھا۔

''اوہ تم......!'' سردار قاہر بیساختہ چونک کر بولا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا۔ سردار قاہر......لیکن اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ تم پرنس کی شان میں گستاخیاں کرو۔ یہ لڑکی یہیں رہے گی۔''

''تم شاید نشے میں ہو۔'' سردار قاہر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''نہیں میں ہوش میں ہوں اور اب دیکھوں گا کہ تمہاری جھولی میں کتنے شعبدے ہیں۔''

''تمہاری موت تمہیں یہاں لائی ہے۔''

''تم بھول رہے ہو......اس بھیڑیئے کی موت مجھے یہاں لائی ہے۔''

''بھیڑیا......کس بھیڑیئے کی بات کر رہے ہو۔''

''وہی جو دونوں بھائیوں کے درمیان افتراق کا باعث بنا تھا۔''

''گھاس کھا گئے ہو تم......بکواس بند کرو اور خود کو زیرِ حراست سمجھو۔''

''ضرور سمجھوں گا اگر تم میرے ہاتھوں سے بچ گئے۔'' صمدانی نے کہا اور دفعتاً جیب سے اعشاریہ دو پانچ کا پستول نکال لیا جس کا رخ سردار قاہر کی طرف تھا۔

حمید اپنا سر سہلاتا ہوا لڑکی سے بولا۔ ''تم ادھر آ جاؤ......میرے پاس ...... یہ دونوں آگ کی زبان میں گفتگو کرنے والے ہیں۔''

''ہاں لڑکی......تم ادھر آ جاؤ...... پرنس کے پاس۔'' صمدانی غرایا۔ اس کی پوری شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ خوش اخلاقی کا پیکر شعلہ جوالا بن گیا تھا۔

لڑکی دوڑتی ہوئی حمید کے پاس آ پہنچی اور وہ اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔ ''یہ دونوں پتہ نہیں کس بات پر دوئل لڑ رہے ہیں۔''

''مجھے کہیں اور لے چلو پرنس......لڑائی جھگڑا نہیں دیکھ سکتی۔''

''مفت بھی نہیں۔'' حمید نے حیرت سے پوچھا۔

حمید سردار قاہر کی طرف دیکھے جا رہا تھا جس کے چہرے پر کچھ دیر قبل پائی جانے والی درندگی اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور کسی قدر بے اطمینانی کی جھلکیاں بھی پائی جاتی تھیں۔

''ہم پورے آٹھ سال بعد ملے ہیں سردار قاہر۔'' صمدانی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا اور حمید سے بولا۔ ''پرنس آپ اس کو میرے پستول سے کور کئے رکھئے......میں ابھی آیا۔''

حمید نے بڑی مستعدی دکھائی......سردار قاہر کے دل کا نشانہ لے کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی اب اس سے دور کھسک گئی تھی۔

صمدانی کے چلے جانے کے بعد سردار قاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہاری شادی بے بی خان سے ہو سکتی ہے......اگر میں چاہوں۔''

''کوفناک آدمی...... میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔''

''پستول جیب میں رکھ لو بیٹے......میں بے بی خان کا ماموں ہوں۔''

''ماموں کیا ہوتا ہے۔''

''اس کی ماں کا بھائی۔''

''بوڑھا آدمی میرا گارجیئن بن کر آیا ہے......میں اس کا کہنا مانوں گا۔''

''بڑے نقصان میں رہو گے۔''

''اب تم کاموش کھڑے رہو۔''

''اتنے میں صمدانی واپس آ گیا۔ اسکے دونوں ہاتھ پشت پر تھے۔ چند لمحے دروازے میں کھڑا سردار قاہر کو گھورتا رہا پھر لڑکی سے بولا۔''تمہاری گاڑی باہر موجود ہے۔ فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔''

''ٹھہرو......نہیں......!'' سردار قاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جاؤ......!'' صمدانی اتنے زور سے دہاڑا کہ دیواریں تک جھنجھنا اٹھیں۔

لڑکی دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

''اور اب پرنس آپ اسے کور کیئے رکھئے......میں اس کے بازو میں ایک انجکشن دوں گا......اور وہ انجکشن ہی اسے انسانیت کے جامے میں لائے گا۔ ہم جیسے مہمانوں کی یہاں بڑی توہین ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے......تم انجکشن لگاؤ......اگر یہ اپنی جگہ سے ہلا بھی تو فائر کر دوں گا۔''

''بالکل...... بالکل......!''

''بے بی کان کا ماموں......!'' حمید نے کہہ کر طنزیہ قہقہہ لگایا۔

سردار قاہر دم سادھے کھڑا تھا لیکن انجکشن لگتے ہی اس کے حلق سے گھٹی گھٹی کراہ نکلی اور وہ چکرا کر گر پڑا۔

''سان فرانسسکو......!'' حمید نے متحیر رہ جانے کی ایکٹنگ کی اور صمدانی نے قہقہہ لگایا۔

''میں آپ کا خادم ہوں پرنس۔'' وہ اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا اور قریب پہنچ کر اس کے ہاتھ سے پستول لینا چاہا۔

''پہلے تم یہ سرنج......ادھر میز پر رکھ دو......!'' حمید نے سر ہلا کر کہا۔

وہ پھر ہنس پڑا اور بولا۔ ”میں آپ کا خادم ہوں...... جو کچھ میں نے کیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا...... ہوش میں آنے کے بعد یہ ہمیں اپنے سر پر بٹھائے گا۔“

”تم بہت گہرے نکلے مسٹر صمدانی۔“

”میرے باپ کو آپ کے دادا حضور کا باڈی گارڈ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔“

”بہت کوب......!“

”بہت خوب کہیے...... میرے سامنے بننے کی کوشش نہیں۔ آپ نے اچانک فرانسیسی انداز میں اردو بولنی شروع کر دی ہے۔“

”صرف اس لڑکی کے لئے موسیو...... وہ جسے تم نے بھگا دیا ہے۔ اس لہجے پر نگوڑ ماریاں جان دیتی ہیں۔“

”اوہو...... آپ نگوڑ ماریاں بھی بول سکتے ہیں۔“

”میری اتالیق سسرالاً لکھنوی تھی۔“

”سسرالاً......!“ صمدانی اسے گھورتا ہوا بولا۔ پھر اس نے کہا۔ ”براہِ کرم آپ لڑکیوں کو دیکھ کر ریشہ خطمی نہ ہو جایا کیجئے...... یہاں اب بھی سسرال والے اسے پسند نہیں کرتے۔“

”مجھے لفظ سسرال ہی پسند نہیں۔ عجیب سی بدبو محسوس کرتا ہوں نام سن کر۔“

”خدارا خاموش رہئے...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ اس نے چاروں طرف دیکھ کر کہا اور اچانک پستول حمید کے ہاتھ سے جھپٹ کر کہا۔ ”آپ کے ہاتھ میں گلدستہ زیادہ حسین لگے گا، جو آپ اپنی بیوی کو پیش کریں گے۔“

حمید نے ذرہ برابر بھی اظہار نہ ہونے دیا کہ اس طرح پستول چھین لینے کا اس پر کیا اثر ہوا ہے۔

”وہ کوفتاک ہے۔“

”کون......؟“

”بے بی کان......!“

صمدانی ہنس کر رہ گیا۔ اس کی تو شخصیت ہی حیرت انگیز طور پر بدل گئی تھی۔

اچانک سردار قاہر کے جسم میں جنبش ہوئی اور صمدانی اس کے قریب پہنچ گیا۔

وہ جھکا ہوا بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سردار قاہر کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ چند لمحے آنکھیں ملتا رہا۔ پھر جیسے ہی صمدانی پر نظر پڑی ''ارے صمدانی بھائی'' کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''آپ کب آئے۔''

''تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔'' صمدانی نے اسکا بازو پکڑتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

''لل......لیکن......مم......میں یہاں کہاں؟'' وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا ہکلایا۔

''بھئی......میں نے تمہیں اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ تم آئے اور اس کمرے میں قدم رکھتے ہی بیہوش ہو گئے۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں صمدانی بھائی۔'' سردار قاہر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''کب سے بیمار ہو۔''

''میں نہیں جانتا صمدانی بھائی۔''

''بیٹھ جاؤ'' صمدانی اس کا بازو پکڑے ہوئے صوفے کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔ ''میں ایک خاص مشن پر آیا ہوں۔''

''مجھے ضرور بتاؤ۔ صمدانی بھائی......!'' سردار قاہر نے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

''یہ شہزادہ افتخار ہیں۔ اقتدار الدولہ بہادر کے بیٹے۔'' صمدانی نے حمید کیطرف اشارہ کیا۔

''زہے عزو شرف۔'' سردار قاہر اٹھ کر کسی قدر جھکتا ہوا بولا اور پھر بیٹھ گیا۔

''جس طرح میرے باپ اقتدار الدولہ کو یہاں لائے تھے اسی طرح میں شہزادہ افتخار کو لایا ہوں۔''

''تو پھر محل میں تشریف لے چلئے آپ لوگ...... یہاں کیوں مقیم ہیں۔''

''تمہارے بیٹے ضیغم نے ہماری یہ توقیر کی ہے۔''

''میں اسے گولی مار دوں گا صمدانی بھائی......آپ دونوں چلئے میرے ساتھ۔''

''پرنس......!'' صمدانی حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

''میں پہلے باتھ روم جاؤں گا۔''

''ضرور......ضرور......!''

حمید انہیں وہیں چھوڑ کر پھر اپنی خواب گاہ میں آیا اور دروازہ بولٹ کر کے ٹرانسمیٹر نکالا۔ فریدی سے رابطہ قائم ہونے میں دیر نہ لگی۔ نئے حالات سے آگاہ ہونے کے بعد فریدی نے کہا۔ ''بہت اچھی خبر ہے۔''

''خدارا......!'' حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''اب تو مجھے اصل حالات سے آگاہ کر دیجئے۔ کہیں بے خبری میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں اوور۔''

''پرواہ مت کرو......اوور اینڈ آل......!''

فریدی کی آواز پھر نہ سنائی دی۔ حمید اسے پکارتا ہی رہ گیا۔

وہ پھر ڈرائینگ روم میں واپس آیا۔ یہاں وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو ایسی پرشوق اور محبت آمیز نظروں سے دیکھے جا رہے تھے کہ حمید کو چکر آ گیا۔

حمید کی آہٹ پر چونکے اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔

''آپ بھی تشریف رکھئے پرنس......!'' صمدانی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

دفعتاً سردار قاہر اٹھتا ہوا بولا۔ ''اچھا صمدانی بھائی......اب اجازت دو۔ محل جا کر آپ لوگوں کے شایان شان استقبال کا انتظام کروں گا۔''

''بہت اچھا قاہر بھائی۔'' صمدانی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

حمید کی طرف دیکھ کر سردار قاہر احتراماً جھکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

صمدانی نے اپنی گھڑی دیکھی اور مسکرا کر بولا۔ ''آٹھ گھنٹے تک یہ مجھے اسی طرح صمدانی بھائی کہتا رہے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ساتواں گھنٹہ گزرتے ہی اسے دوسرا انجکشن دیا جائے۔''

''صمدانی چچا میں انجکشن کے بغیر ہی کہنے پر تیار ہوں۔'' حمید نے بوکھلاہٹ کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا غلام ہوں پرنس! آپ ہی کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ آپ کی توہین ہوئی تھی اس لئے غصہ آ گیا۔''

پھر دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ سردار ضیغم دکھائی دیا اور اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ دو مسلح سپاہی بھی تھے جن کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آئے۔

''میرے باپ سردار قاہر کہاں ہیں۔'' وہ پیر پٹخ کر دہاڑا۔

''قاہر بھائی ابھی تشریف لے گئے ہیں۔'' صمدانی نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم نے ان پر ریوالور تانا تھا۔''

''یہ کیا بکواس ہے لڑکے میں تمہارے باپ کا دوست ہوں۔ میرا احترام کرو وہ مجھے صمدانی بھائی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے موسیو زیگم...... میں نے بھی سنا تھا۔'' حمید بولا۔

''تم خاموش رہو۔'' ضیغم کا لہجہ اہانت آمیز تھا۔

''موسیو زیگم مجھے بھی جلد حرارہ آ جاتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ لڑکی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی موسیو زیگم......!'' حمید نے مغموم لہجے میں کہا۔

''تمہارے فادر کہہ گئے ہیں وہ ہمیں جلد ہی محل میں لے چلیں گے۔ دیکھوں بے بی کان کیسی ہے۔''

''شٹ اپ...... اس کا نام نہ لینا...... ورنہ سر توڑ دوں گا۔''

''کیا تم اس سے محبت کرتے ہو۔''

''لڑکے......!'' دفعتاً صمدانی غرایا۔ ''میں پرنس کی شان میں گستاخی نہیں برداشت کر سکتا۔ اب تمہاری زبان سے کوئی ناروا جملہ ادا ہوا تو میرا تھپڑ تمہارے منہ پر پڑے گا۔''

ضیغم غراتا ہوا صمدانی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ حمید بیچ میں آ گیا۔ ضیغم نے اسے دھکا دینا چاہا لیکن حمید نے جوڈو کے ایک داؤ کے ذریعہ اس کو منہ کے بل گر جانے پر مجبور کر دیا۔

اس کے دونوں محافظ خبردار خبردار کہتے ہوئے آگے بڑھے اتنے میں ضیغم بھی دوبارہ اٹھ کر حمید پر جھپٹا۔ حمید اگر ایک طرف ہٹ نہ جاتا تو اس بار اسے خاصی چوٹ کھانی پڑتی۔ ضیغم فولاد کی طرح ٹھوس تھا۔

باڈی گارڈز نے فائرنگ شروع کر دینے کی دھمکی دی تھی کہ صمدانی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''سردار قاہر کا بیٹا اتنا بے بس ہے کہ دو بندوقچی ساتھ لئے پھرتا ہے۔''

''نکل جاؤ...... چلے جاؤ۔'' ضیغم باڈی گارڈز کی طرف ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

وہ جہاں تھے وہیں تھم گئے اور کھڑے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتے رہے۔

''باہر جاؤ۔'' وہ پھر گرجا۔ انہوں نے اس بار مشینی انداز میں تعمیل حکم کی تھی۔

ضیغم پھر حمید کی طرف جھپٹا۔ لیکن اس بار صمدانی نے جیب سے دوبارہ پستول نکالتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ''ٹھہر جاؤ۔''

''یہ بدعہدی......!'' ضیغم رک کر ہانپتا ہوا بولا۔ ''اب تم نے پستول نکالا ہے، بزدل بوڑھے۔''

''لیکن میری نیت میں فتور نہیں ہے۔ میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی ابھی مجھے علم ہوا ہے کہ پرنس جوڈو کے ماہر ہیں۔ تم ان سے پار نہ پاسکو گے۔ دماغ ٹھنڈا رکھو...... دیوانگی اچھی چیز نہیں ہے۔''

قبل اس کے کہ ضیغم کچھ کہتا سردار قاہر کمرے میں داخل ہوا اور انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

پھر ضیغم سے بولا۔ ''یہاں سے چلے جاؤ بدتمیز...... کیا تم صمدانی بھائی سے جھگڑا کر رہے ہو۔ یقیناً تم نے گستاخی کی ہوگی۔ ورنہ ہرگز پستول نہ نکالتے۔ تمہیں بھتیجا سمجھ کر شفقت سے پیش آتے۔''

حمید نے ضیغم کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے اور صمدانی نے مسکرا کر پستول پھر جیب میں ڈال لیا۔ اب ضیغم اپنے باپ کو گھورتا ہوا واپس جا رہا تھا۔

''صمدانی بھائی اسے معاف کردیجئے۔'' سردار قاہر گڑگڑایا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ محل کے ایک خوبصورت حصے میں فروکش تھے اور سردار قاہر بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا۔ ''صمدانی بھائی...... بیگم ظفر یاب یعنی میری چھوٹی بہن ...... یعنی بے بی خان کی والدہ...... ہرچند کہ اس رشتہ پر متفق نہیں لیکن میں انہیں راضی کرلوں گا۔''

''دونوں خاندانوں کی بہتری اسی میں ہے۔''

شام تک حمید بور ہوتا رہا۔ اپنے کمرے سے نکلا تو سردار قاہر کو پھر بے ہوش دیکھا۔ وہ ایک آرام کرسی پر پڑا ہوا تھا اور صمدانی اس کے قریب ہی اخبار بینی میں مصروف تھا۔ اس کی پشت حمید کی طرف تھی۔ حمید خاموش کھڑا رہا۔ صمدانی کو اس کی آہٹ نہیں مل سکی تھی۔ کیونکہ چاروں طرف یہاں فرش پر موٹے موٹے قالین پڑے ہوئے تھے۔

حمید دبے پاؤں چلتا ہوا ایک بہت بڑے آرائشی گلدان کے پیچھے جا چھپا۔ پوزیشن ایسی

تھی کہ اگر وہ دونوں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا بھی شروع کر دیتے تو انہیں حمید نہ دکھائی دیتا۔

کچھ دیر بعد اس نے سردار قاہر کی بھرائی ہوئی سی آواز سنی۔ ''صمدانی، صمدانی بھائی...... مم...... مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں بار بار اس طرح سونے کیوں لگا ہوں۔''

''موسم کا اثر ہے...... فکر نہ کرو۔''

''تت...... تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے...... صمدانی بھائی۔''

''بالکل نہیں۔''

''پرنس کہاں ہیں۔''

''اپنے کمرے میں...... وہ بیکاری میں زیادہ تر سوتے رہتے ہیں۔ خیر اب تم اصل معاملے کی طرف آ جاؤ۔''

''شش شادی...... ضرور ہوگی صمدانی بھائی۔''

''وہ تو ہوگی ہی...... میں تم سے اس آدھے سرخ ٹکڑے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''خخ...... خطرہ ہے صمدانی بھائی۔''

''فضول باتیں نہیں...... آدھا ٹکڑا مجھے ہر حال میں چاہئے۔''

''وہ تو نہیں ہے میرے پاس......!'' قاہر کی آواز آئی۔

''وہ تو ہر حال میں مجھے چاہئے...... ورنہ بڑا خون خرابہ ہوگا۔''

''تت تلاش کرنا پڑے گا...... صمدانی بھائی۔''

''ضرور تلاش کرو...... دس بجے رات تک مجھے مل جائے۔''

''لل لیکن صمدانی بھائی...... اگر وہ مل بھی گیا تو۔''

''تمہیں اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔ تمہارا ہر حال میں خیال رکھا جائے گا۔''

''میں کہہ رہا تھا صمدانی بھائی کہ وہ پرانی باؤلی کا قصہ ہے اور اب وہاں قدم رکھنا مشکل ہے۔''

''کیوں؟''

''بھیڑیا...... بھیڑیا...... باؤلی ہی سے نمودار ہوتا ہے۔''

''بکواس ہے؟''

''یقین کرو صمدانی بھائی۔ وہ اسی بھیڑیئے کی روح ہے جو خان دوراں کے ہاتھوں مارا

گیا تھا۔''

''میں کہتا ہوں بکواس مت کرو۔''

''تمہاری مرضی! میں تلاش کرنے جارہا ہوں لیکن اگر وہ ٹکڑا نہ ملا تو۔''

''تمہارے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

''بات دراصل یہ ہے صدانی بھائی کہ وہ ضیغم کے پاس ہے۔ ضیغم بڑا گستاخ لڑکا ہے اور مجھے بھی خاطر میں نہیں لاتا۔''

''میں کچھ نہیں جانتا...... لیکن دیکھو ضیغم کو اس کا علم نہ ہونے پائے کہ میں نے اس کا مطالبہ کیا ہے۔''

''ارے چور۔'' دفعتاً حمید نے اپنی پشت پر کسی لڑکی کی چیخ سنی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''اوہو...... بے بی کان...... ویل کم...... ویل کم......!'' وہ سیدھا کھڑا ہو کر کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

قاہر اور صدانی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دردانہ نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ''یہ شہزادے صاحب ادھر چھپے ہوئے آپ لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔''

''میں ہر وقت اردو سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں...... میں نے سوچا شائد یہ لوگ گفتگو میں نئے نئے محاورے استعمال کریں۔ اس لئے مجھے فائدہ اٹھانا چاہئے۔'' حمید نے کہا اور ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

بھیڑیئے کا حملہ

حمید ہنسے جارہا تھا اور وہ سب دم بخود کھڑے تھے۔ دردانہ کی نظر اپنے ماموں سردار قاہر کی طرف تھی اور وہ کسی قدر متحیر بھی دکھائی دیتی تھی۔

دفعتاً سردار قاہر نے حمید سے کہا۔ ''پرنس! ایسی بات تھی تو آپ کو ہمارے پاس بیٹھنا تھا۔''

''اوہو......تم سمجھتے نہیں سردار قاہر...... پرنس دوسروں کو متحیر کر دینے میں بے حد لذت محسوس کرتے ہیں۔ اسے ان کی ہابی سمجھ لو۔''

''اچھا یہ بات ہے صمدانی بھائی۔'' سردار قاہر ہنسنے لگا اور حمید نے محسوس کیا جیسے دردانہ اسے پاگل سمجھ رہی ہو۔

اچانک دردانہ بولی۔ ''مجھے حیرت ہے ماموں حضور۔''

''کس بات پر حیرت ہے بیٹی۔''

''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی پوری شخصیت بدل کر رہ گئی ہو۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں بیٹی! میں اور صمدانی بھائی بچپن سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔''

''تو کیا یہ واقعی پرنس افتخار ہیں۔''

''ہاں بیٹی...... بھلا اس میں شبہ کی گنجائش کہاں۔''

پھر وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر واپس مڑ گئی۔ حمید اس موقع کو ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے تو دوبارہ سامنا ہوا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑا اور لان پر پہنچ کر ہی دردانہ کو معلوم ہو سکا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

وہ رک کر مڑی اور پُرتنفر لہجے میں بولی۔ ''تم کوئی بھی ہو۔ مجھے تم سے قطعاً دلچسپی نہیں۔''

''کم از کم فرانس میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکیاں اتنی بے مروتی سے پیش نہیں آتیں۔''

''تو پھر یہاں مرنے کیوں آئے ہو...... فرانس ہی واپس جاؤ۔''

''مرنا تو یہیں ہے...... لڑکیاں لفٹ دیں یا نہ دیں۔''

''میرے پیچھے مت آؤ۔''

''کم از کم چچی حضور سے تو مل ہی لوں۔''

''وہ نہیں ملنا چاہتیں۔''

''چچا حضور کی کیسی طبیعت ہے۔''

''پہلے سے بہتر ہے۔ لیکن کوئی ان سے مل نہیں سکتا۔''

''اچھا تو میری تصویر ہی ان تک پہنچا دو۔''

''کیوں......؟''

''انہیں اطمینان ہو جائے کہ میں بھی بہت خوبصورت ہوں۔''

''تم......!'' وہ تحقیر آمیز انداز میں ہنس پڑی۔

''نہیں ہوں......؟''

''گھسیارے معلوم ہوتے ہو۔''

''یہ کیا ہوتا ہے......میں گھسیارے کے معنی نہیں جانتا۔''

''اپنی کسی مقامی گرل فرینڈ سے پوچھ لینا۔''

''بے بی کان! میں نے سادھوؤں کی سی زندگی گزاری ہے۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں۔''

''حالانکہ تم صورت سے ہی بدمعاش لگتے ہو۔''

''تمہارے ہی پردادا میرے بھی تھے۔''

''شٹ اپ......!''

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ضیغم آتا دکھائی دیا۔ دردانہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

ضیغم حمید کو گھورتا چلا آرہا تھا۔ قریب پہنچ کر دہاڑا۔ ''یہاں قیام کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ تم جہاں چاہو آزادی سے گھومتے پھرو۔''

''میرے چچا حضور کا محل ہے۔'' حمید نے سرد لہجے میں کہا۔

''چلے جاؤ'' وہ اس کے اقامتی حصہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

''موسیو زیگم......بدتمیزی نہیں۔''

بس اتنا ہی کافی تھا۔ ضیغم دوپہر کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے حمید پر جھپٹ پڑا۔ حمید پہلے ہی سے اس کے لئے تیار تھا۔ کنائی کاٹ کر اس کا وار خالی دیا اور پھر جو ایک داؤ جوڈو کا لگایا ہے تو ضیغم اچھل کر دور جا گرا۔ بھاری بھرکم آدمی تھا اس لئے پھرتی سے اٹھ نہ سکا اور حمید دردانہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ''یہ بہت بیوکوف آدمی ہے۔ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ورنہ میرے ہاتھوں سے مارا جائے گا۔''

''میں تجھے پیس کر رکھ دوں گا۔'' ضیغم اٹھتا ہوا چیخا۔

سچ مچ اس بار جھپٹنے کا ایسا ہی انداز تھا جیسے مرنے مارنے کی ٹھان لی ہو۔

حمید پھرتی سے جھکا اور اسے اپنی پشت پر اٹھا کر پھر دور پھینک دیا۔

دردانہ کھڑی حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ دھند لکا پھیلنے لگا تھا۔ لیکن ابھی اتنی روشنی تھی کہ وہ دور سے بھی پہچانے جاسکتے۔

اس بار ضیغم اٹھا تو خالی ہاتھ نہیں تھا اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ ہانپتا ہوا بولا۔ ''اب تم زمین پر ناک رگڑو...... ورنہ گولی ماردوں گا۔''

''ضیغم بھائی...... یہ بزدلی ہے۔'' دفعتاً دردانہ بولی۔

''تم چپ رہو...... اندر جاؤ۔''

اتنے میں برآمدے میں صمدانی کی للکار سنائی دی۔ ''دیکھو قاہر تمہارے لڑکے نے پرنس پر ریوالور تان رکھا ہے۔ یہ اتنا جھگڑالو کیوں ہے؟''

اس کے بعد وہ دونوں جھپٹتے ہوئے لان پر پہنچے تھے۔ ''ضیغم...... تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ریوالور ہولسٹر میں رکھ لو۔'' قاہر نے کہا۔

''آپ اندر جایئے...... میں یہاں کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوں۔'' ضیغم کا جواب تھا۔

''ضض...... ضیغم بیٹے......!'' قاہر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مم...... مجھ سے ایسے لہجے میں گفتگو۔''

''تھپڑ رسید کیجئے ماموں جان...... یہ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔'' دردانہ بپھر گئی۔

''شٹ اپ!'' ضیغم دہاڑا۔ ''تم سب اندر جاؤ...... ورنہ اپنی بے عزتی کے خود ذمہ دار ہو گے۔ چلو جاؤ۔''

اس نے بڑے ڈراؤنے انداز میں اپنے ریوالور والے ہاتھ کو جنبش دی تھی۔

''چلو...... چلو......!'' صمدانی نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''اس وقت اسی کا کہنا کر دو۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔''

''تم سے تو میں ابھی نپٹتا ہوں۔'' ضیغم نے صمدانی کو دھمکی دی۔

''بزرگوں کے منہ نہیں آیا کرتے بیٹے! معلوم نہیں تمہاری تربیت کیسے ہوئی ہے۔''

''چچ چلو...... صمدانی بھائی۔'' قاہر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

وہ سب ضیغم کو وہیں چھوڑ کر اندر آ گئے تھے۔

دردانہ قاہر کو گھورے جارہی تھی اور قاہر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا فرش کو تک رہا تھا۔

''شائد میں خواب دیکھ رہی ہوں۔'' دردانہ بڑبڑائی۔

''جاگتے میں......!'' حمید نے پوچھا۔

''نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے زمین اپنے محور سے ہٹ گئی ہو۔ یہ ماموں جان ہیں۔ انہیں کیا ہوگیا ہے۔ یہ تو اس وقت ضیغم بھائی کی کھال اتار دیتے۔''

''اللہ جب چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔'' صمدانی نے کہا۔

''ناممکن ...... مجھے یقین نہیں آتا۔'' دردانہ اسے گھورتی ہوئی بولی۔ چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''تم بھی بالکل بدلے ہوئے نظر آتے ہو۔ جب میں نے تمہیں ٹرین میں دیکھا تو تم کچھ اور تھے۔''

قبل اس کے کہ صمدانی کچھ کہتا حمید باتھ روم کے بہانے وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے پھر فریدی سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ حالات گنجلک ہو گئے تھے۔ صمدانی حد درجہ پُراسرار ثابت ہوا۔ اس کی شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

حمید نے فریدی کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کرتے ہوئے پوچھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔

''دونوں پر کڑی نظر رکھو......!'' فریدی نے جواب دیا۔ ''یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ان دونوں کے درمیان اس گفتگو کا مقصد کیا تھا۔ تم یہ سوال براہِ راست صمدانی سے بھی کر سکتے ہو......اوور......!''

''آخر یہ بھیڑیا کیا بلا ہے۔'' حمید نے پوچھا۔

''بے صبری اچھی چیز نہیں۔ جلد معلوم ہو جائے گا اوور اینڈ آل......!''

گفتگو ختم کر کے حمید پھر ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ صمدانی تنہا تھا۔ حمید کو دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور مسکرا کر بولا۔ ''پرنس چھپ کر ہماری گفتگو سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے آپ کے ساتھ بھیجنے میں اقتدار الدولہ بہادر کی کچھ مصلحت اور بھی تھی۔''

''اگر کچھ حرج نہ ہو تو میں بھی ان کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔'' حمید نے کسی گھنے

بچے کی طرح منہ پھلالیا۔ صمدانی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دردانہ خان کمرے میں داخل ہوئی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

''آپ لوگ یہاں سے فوراً چلے جایئے۔'' وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

صمدانی اسے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ لیکن حمید نہیں اٹھا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں سوال کیا۔ ''کیوں......؟''

''ضیغم بھائی بے حد خطرناک آدمی ہیں۔ انہوں نے ماموں حضور کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے اور آپ لوگوں کی فکر میں ہیں۔''

''آخر کیوں......؟'' صمدانی بولا۔

''میں نہیں جانتی۔''

''مجھے چچی حضور کے پاس لے چلو......!'' حمید نے اس سے کہا۔

''یہ بھی ناممکن ہے۔''

''تو پھر میں یہیں مرجاؤں گا...... اکتدار الدولہ کا بیٹا اتنا بزدل نہیں ہوسکتا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔''

''اچھا تو پھر میرے ساتھ چلو۔''

''یہ ہوسکتا ہے۔'' حمید نے صمدانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ جایئے پرنس...... میں یہیں رہوں گا اور اپنے دوست قاہر کو اس ظالم کے پنجے سے رہائی دلاؤں گا۔''

''اچھا...... اچھا......!'' حمید سر ہلا کر بولا اور دردانہ کے ساتھ جانے کیلئے تیار ہوگیا۔

کچھ دیر بعد اس تبدیلی کی اطلاع بھی فریدی کو دینی پڑی تھی۔ دردانہ نے اسے عمارت کے ایک دور افتادہ حصے میں چھوڑا تھا اور کچھ دیر کے لئے غائب ہوگئی تھی۔ واپس آئی تو پہلے سے بھی زیادہ پریشان تھی۔

''مجھے تو اس ضیغم سے نفرت ہوگئی ہے۔ تم واقعی بہت بہادر ہو۔ میں تمہاری عزت کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''دل دکھانے کے باتیں نہ کرو۔ میں تو بہت بُرا ہوں۔''

''ضیغم کی طرح بزدل تو نہیں ہو......اس نے صمدانی صاحب کو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔لیکن وہ کسی طرف نکل گئے۔''

''اوہو......اچھا......!'' حمید بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔

''وہ ان سے کسی چیز کا مطالبہ بھی کر رہا تھا......؟''

''کس چیز کا......؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی......میں نے دونوں کی گفتگو سنی ضرور تھی لیکن دونوں ہی مبہم انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔مثلاً ضیغم نے صمدانی صاحب سے کہا تھا۔''میں نے ابا جان سے سب کچھ معلوم کرلیا ہے۔تم زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے۔لاؤ آدھا ٹکڑا میرے حوالے کردو۔''

''اوہو......پھر کیا ہوا۔''

''ایسا پھرتیلا بوڑھا آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا......اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور غائب ہوگیا۔ضیغم کے آدمی اسے چاروں طرف ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

''یہ تو بہت بُرا ہوا۔میں تنہا رہ گیا۔''

''تم میرے چچا کے بیٹے ہو......تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے۔''

''ارے......تم بھی تو بھیڑیئے کی طرح گُراتی ہو۔''

دردانہ ہنس پڑی پھر بولی۔''وہ تو مذاق تھا۔لیکن مجھے اس غراہٹ کے لئے بڑی پریکٹس کرنی پڑی تھی۔''

''ایسا کیوں کرتی ہو۔''

''مجبوراً مجھے صبح دیر تک سونے کی عادت ہے۔امی حضور اس کی مخالف ہیں۔میری خادمہ کو حکم ہے کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے مجھے اٹھا دیا کرے۔اب عالم یہ ہے کہ جہاں اس نے مجھے جگانے کی کوشش کی میں نے غرانا شروع کردیا۔بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور امی حضور سے کہہ دیتی ہے کہ وہ ان کا حکم بجالائی ہے۔''

''بہت چالاک ہو۔'' حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

''اور میری خادمہ یہ سمجھتی ہے کہ اس غراہٹ کا تعلق پرانی باؤلی والے بھیڑیئے سے ہے۔''

''یہ باؤلی والا بھیڑیا کیا مصیبت ہے۔''

''لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اسی بھیڑیئے کا بھوت ہے جو دادا حضور کی رائفل کا نشانہ بنا تھا اور تمہارے دادا خواہ مخواہ بور ہو گئے تھے۔ سچ کہتی ہوں مجھے اس کہانی پر بہت ہنسی آتی ہے۔''

''ہنسی کیوں آتی ہے؟''

''آخر یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہوا کرتے ہیں۔ اتنی ذرا سی بات پر اس حد تک ناچاقی۔''

''نہیں انہیں کچھ نہ کہو...... وہ بہت پیارے اور سچے لوگ تھے۔ کھل کر نفرت کرتے تھے اور پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا...... نہ نفرت نہ محبت...... لوگ مصلحتاً ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں اور زندگی بھر اداکاری کرتے رہتے ہیں۔''

''تم بہت گہری باتیں بھی کر سکتے ہو......!'' وہ دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں صدانی کے لئے کیا کروں۔'' حمید نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''اگر ان کے مقدر میں موت لکھی ہے تو ضیغم کے ہاتھ سے ضرور مارے جائیں گے۔ مجھے حقیقتاً اپنے ماموں اور ضیغم سے بے اندازہ نفرت ہے۔ لیکن امی حضور کی وجہ سے برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

''تمہیں ان دونوں سے نفرت کیوں ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔''

''اچھا...... بھیڑیئے کے بارے میں بتاؤ اور یہ پرانی باؤلی کیا چیز ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ بات ہوئی۔'' وہ اس کے چہرے کے قریب انگلی نچا کر ہنسی اور پھر بولی۔

''یہاں دھری رہ گئی اردو کی ساری قابلیت اب بلاؤ۔ اپنی اتالیق کے لکھنوی میاں کو۔''

''تم ہی بتا دو...... اے میری بنت عم......!''

''پرانے زمانے میں بڑے بڑے کنوئیں بنوائے جاتے جن کے اندر چاروں طرف پانی سے کچھ اوپر کمرے اور دالانیں تعمیر کی جاتیں تھیں جن میں گرمیوں کی دوپہریں گذاری جاتی تھیں۔''

''اوہو...... تو یہاں کوئی ایسی چیز موجود ہے۔''

''ہاں...... آں...... وہی پرانی باؤلی کہلاتی ہے۔ لیکن عرصہ دراز سے اسے استعمال

نہیں کیا گیا۔ پہلے ہی سے آسیب زدہ تھی۔ اب وہاں کسی بھیڑیئے کا بھوت بھی آ بسا ہے۔''

''وہ کب سے آیا ہے۔''

''غالباً پچھلے تین سال سے۔''

''کیا محل والوں پر بھی اس نے کبھی حملہ کیا ہے۔''

''نہیں تو......!''

''پھر وہ اس بھیڑیئے کا بھوت کیسے ہوسکتا ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔ قلعے کے عوام یہی کہتے ہیں کہ وہ بھوت ہے اور محل والے اس کی تردید کرتے پھرتے ہیں تاکہ لوگوں کا خوف دور ہوسکے۔ ہمارے سپاہیوں نے کئی بار اس کا تعاقب کر کے اس پر گولیاں بھی چلائی ہیں لیکن وہ اب بھی زندہ ہے۔''

''میں اس کو ماروں گا۔''

''اپنے چار سو دس کے کھلونے سے۔''

''اس کی ہنسی نہ اڑاؤ وہ بہت کوفناک چیز ہے۔''

''اچھا اب میں جارہی ہوں...... یہاں سے نکلنا نہیں۔ ورنہ تم خود ہی کسی حادثے کے ذمہ دار ہو گے۔''

''نہیں نکلوں گا۔''

وہ چلی گئی اور حمید نے پھر ٹرانسمیٹر نکالا۔ لیکن اس بار فریدی سے رابطہ قائم نہ ہوسکا۔

آدھے گھنٹے تک تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ اسے کال کرتا رہا لیکن ناکامی ہی ہوئی۔

اس کے بعد دردانہ پھر آ گئی اور اسے یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ وہ اس کے لئے ایک بڑے سے ناشتہ دان میں کھانا لائی تھی۔

''صمدانی کا پتہ چلا۔'' حمید نے اس سے پوچھا۔

''ضیغم بھی غائب ہوگیا ہے۔ تم جلدی سے کھانا کھالو...... پھر میں تمہیں یہاں سے بھی لے چلوں گی۔''

''اوہو...... اب میں چوروں کی طرح زندگی بسر کروں گا۔''

''جو میں کہوں کرتے رہو...... ورنہ اچھا نہ ہوگا۔''

''اچھا......اچھا......کیا تم نہیں کھاؤ گی میرے ساتھ۔''

''چلو......میں بھی کھالوں گی۔ جلدی کرو۔''

کھانے کے دوران میں خاموشی رہی۔ اس کے بعد حمید نے تمباکو نوشی کے لئے پائپ نکالا ہی تھا کہ وہ بول پڑی۔ ''نہیں...... یہاں نہیں۔''

''تمہاری مرضی۔'' حمید نے پائپ کو جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں عقبی دروازے سے باہر نکلے۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ اس حصے میں کہیں بھی روشنی دکھائی نہ دیتی تھی۔

حمید نے اپنی چھوٹی سی دو نالی بندوق کوٹ کی داہنی آستین میں چھپا رکھی تھی۔

وہ عمارات کے سلسلے سے دور ہوتے گئے۔ اچانک انہوں نے کسی مرد کے رونے کی آواز سنی جو ان کے چلنے ہی کی سمت سے آرہی تھی۔ دونوں رک گئے۔ آواز قریب ہوتی جارہی تھی۔

''میرے مہمان......میرے مہمان......ہائے میرے مہمان...... خداوندا میں کیا کروں۔ ہائے روسیاہ ہوگیا۔'' اور پھر دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کردیا گیا۔

''یہ......یہ ضیغم بھائی کی آواز ہے۔'' دردانہ آہستہ سے بولی۔

''ہمیں پھانسنے کے لئے جال پھیلایا ہے اس نے۔''

''خدا جانے......!'' دردانہ کا لہجہ پُر تشویش تھا۔

وہ ایک درخت کے موٹے سے تنے کی اوٹ میں ہوگئے اور ضیغم دہاڑیں مار مار کر روتا ہوا ان کے قریب ہی سے گزر گیا۔

حمید سوچ رہا تھا کہ کہیں صمدانی کا داؤ نہ چل گیا ہو۔ لگا دیا ہو اس کے بھی انجکشن...... آدمی تھا یا بھوت......لیکن اب وہ خود کہاں ہوگا۔ باپ بیٹے دونوں ہی قابو میں آگئے لیکن وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ کیا چکر ہے...... باؤلی اور ریشم کے ٹکڑوں کا کیا قصہ ہے۔''

ضیغم کی آواز دور ہوتی جارہی تھی۔ دفعتاً اس نے دردانہ سے کہا۔ ''ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔''

''کک......کیا تم نہیں سن رہے۔''

''وہ بہت دور نکل چکا ہے۔''

''غغ......غراہٹ کی آواز۔''

حمید نے ضیغم کی آواز کی طرف سے توجہ ہٹائی ہی تھی کہ غراہٹ بھی سن لی۔ یہ غراہٹ بھی قریب کی نہیں تھی۔ سمت کا اندازہ بھی نہ ہو سکا۔

''بہتر ہوگا کہ اب ہم یہیں ٹھہر کر اس کا بھی انتظار کریں۔'' حمید نے کہا۔

''مم...... مجھے خوف معلوم ہو رہا ہے۔''

''بالکل نہ ڈرو...... چار سو دس بور کا کھلونا میرے پاس موجود ہے۔''

غراہٹ قریب ہوتی جا رہی تھی اور اب حمید سمت کا تعین بھی کر سکتا تھا۔ آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا انہیں کی سمت آ رہا ہے۔

حمید نے پھرتی سے بندوق نکالی اور آواز کی سمت فائر کر دیا۔ غراہٹ کا سلسلہ یکلخت ٹوٹ گیا۔ ایسا لگا جیسے فائر کی آواز نے بھیڑیئے کے قدم روک دیئے ہیں۔ لیکن حمید کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ بے آواز آئے گا۔

اس نے اسی سمت دوسرا فائر بھی کر دیا۔ اس بار بھیڑیئے کی آواز غراہٹ سے مختلف تھی اور یہ مسلسل آواز تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

''اس بار زخمی ہو کر بھاگا ہے۔'' حمید بڑبڑایا۔

''مجھے تو نہیں دکھائی دیا تھا تم نے کیسے دیکھ لیا۔''

''میں آواز پر نشانہ لگاتا ہوں۔''

اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ ہوئی اور وہ چونک پڑے۔ دوڑنے والا چیخنے لگا تھا۔ ''کون فائر کر رہا ہے...... سامنے آئے...... پرنس......صمدانی صاحب۔''

''ضیغم بھائی۔'' دردانہ آہستہ سے بولی۔ ''شائد فائروں کی آواز سن کر پلٹ آئے ہیں۔''

''صمدانی صاحب...... پرنس! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں شرمندہ ہوں۔ مجھے مہمانوں کا احترام کرنا چاہئے تھا۔'' ضیغم بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''میں تو اب اس سے ملوں گا۔'' حمید آہستہ سے بولا۔

''کہیں دھوکا نہ ہو۔''

''کچھ بھی ہو......دھوکا ہوا تو گولی ماردوں گا۔'' حمید نے کہا اور ضیغم کو آوازیں دینے لگا۔

''پرنس آپ کہاں ہیں!''

''میں یہاں ہوں۔''

''کیا آپ نے فائر کئے تھے۔''

''ہاں......بھیڑیا میرا پیچھا کر رہا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ وہ میرا پالتو بھیڑیا ہے۔'' ضیغم کی آواز آئی۔

''خداوندا......!'' دردانہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''میں تصور بھی نہ کرسکتی۔''

''اچھا اب تم چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ۔'' حمید نے اس سے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھے۔''

''میرے خیال سے بھی یہی مناسب ہے۔ لیکن تم ہوشیار رہنا۔'' دردانہ نے کہا اور اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

اتنے میں ضیغم اسی درخت کے قریب پہنچ گیا جس کے نیچے حمید کھڑا تھا۔ ضیغم نے ٹارچ روشن کی اور حمید پر نظر پڑتے ہی گڑگڑانے لگا...حمید نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں اپنا عزیز سمجھتا ہوں۔''

اچانک بائیں جانب سے صمدانی کی آواز آئی۔ ''ضیغم...... میرے بچے میں نے تمہیں معاف کردیا۔ خدا سب کو نرم دلی عطا کرے......!'' قریب پہنچ کر اس نے ضیغم کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''چلو میرے ساتھ اور پرنس آپ جا کر آرام کیجئے۔''

پھر حمید وہیں کھڑا رہ گیا تھا اور وہ دونوں آگے بڑھ کر اندھیرے میں گم ہو گئے تھے۔

وائر ریکارڈر

پھر حمید اندھیرے میں راستہ بھول گیا تھا اور آدھے گھنٹے تک ادھر اُدھر بھٹکتے رہنے کے

بعد جائے رہائش تک پہنچ سکا تھا۔

صمدانی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

''مجھے افسوس ہے پرنس کہ آپ کو تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑی۔'' اس نے کہا۔ ''اب آپ سچ مچ آرام کیجئے۔ بقیہ معاملات میں خود ہی دیکھوں گا۔ آخر ہمارے گھرانے پر اسی لئے تو آپ کے اجداد اتنا اعتماد کرتے تھے۔''

حمید کراہتا ہوا آرام کرسی میں گر گیا۔ صمدانی نے تالی بجائی اور ایک ملازم اندر داخل ہوا۔

''بلیک کافی.... تیز گرم....!'' اُس نے اس سے کہا اور وہ تعظیماً جھک کر واپس چلا گیا۔

''اس طرح آپ کی تھکن دور ہو جائے گی اور آپ آرام سے سو سکیں گے۔'' صمدانی حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

''چچا صمدانی......!'' حمید اٹھ کر سیدھا بیٹھتا ہوا بولا۔ ''آخر ضیغم کیسے سیدھا ہو گیا۔''

''وہی انجکشن پرنس! اگر شیر کو دے دیا جائے تو اسے بکریاں سینگوں پر رکھ لیں گی۔''

''کس طرح......!''

''کنپٹی پر پڑنے والے ایک گھونسے نے اسے بیہوش کیا تھا اور پھر انجکشن دینے میں آسانی ہو گئی تھی۔''

''تم حیرت انگیز ثابت ہوئے ہو چچا صمدانی۔''

''آپ کے اجداد جوہر شناس تھے!''

''اوہ......!'' حمید پیٹ دبائے ہوئے اٹھا اور صمدانی سے بولا۔ ''میرا معدہ...... پتہ نہیں یہ لوگ کیا کھاتے کھلاتے ہیں۔ میں ابھی آیا۔''

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چل پڑا۔ ایک بار پھر اس نے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ فریدی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ جھلاہٹ میں اس نے سوئچ آف کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

پہلی نظر میں کمرہ خالی دکھائی دیا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قد آدم گلدان کے پیچھے کوئی چھپا ہوا ہو۔ غالباً اس نے نیلے رنگ کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔

وہ گلدان کی طرف جھپٹا اور دردانہ اچھل پڑی۔ پھر فوراً ہی سنبھل کر اسے خاموش رہنے

کا اشارہ کیا۔حمید نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

''بوڑھے نے کافی پاٹ میں ایک کیپسول ڈالا تھا'' دردانہ آہستہ سے بولی۔''پھر اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔کیا تم کافی پینے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

''اس نے میرے ہی لئے کافی منگوائی تھی۔ میں ذرا باتھ روم تک گیا تھا۔''

''کیا تمہیں بوڑھے پر اعتماد ہے۔''

''ابا حضور کو تو ہے......پھر مجھے بھی ہونا چاہئے۔''

''وہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔''

''اچھا میں دیکھ لوں گا......تم اب یہاں سے چلی جاؤ۔''

''پھر کہتی ہوں......کافی میں ہاتھ نہ لگانا۔''

''اچھا اچھا......اب تم جلدی سے چلی جاؤ۔کوفناک باپ،کوفناک بیٹا......دونوں بکری بن گئے۔ مجھے بھی تشویش ہے۔صمدانی کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔''

''اوہ......!'' دردانہ نے طویل سانس لی اور مسکرا کر بولی۔''اب میں مطمئن ہوں۔ جا رہی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔حمید اس میز کی طرف متوجہ ہوا جس پر کافی پاٹ اور دو تین کپ رکھے ہوئے تھے۔اس نے ایک کپ میں کافی انڈیلی اور اسے قد آدم گلدان میں الٹ دیا۔تھوڑی سی کپ میں باقی رہنے دی اور کپ کو دوبارہ کافی پاٹ کے قریب رکھ کر خود سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جسم ڈھیلا چھوڑا اور آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر بعد اس نے تین آوازیں سنیں۔

صمدانی کہہ رہا تھا۔''اوہو...... پرنس کرسی ہی پر سو گئے۔ ایسا لاپرواہ اور جیوٹ کا جوان آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔''

''اس میں کیا شکر ہے۔''ضیغم نے کہا۔''مجھے پھرتیلے پن پر حیرت ہوتی ہے۔کوندے کی لپک ہیں پرنس۔''

''لیکن تم بہت نالائق ہو۔'' یہ سردار قاہر کی آواز تھی۔

''مجھے ندامت ہے......زندگی بھر رہے گی۔''ضیغم کی آواز آئی۔

حمید بدستور آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔

''اب ہمیں یہاں سے فوراً چل دینا چاہئے۔'' صمدانی بولا۔

''لل...... لیکن پرنس......!'' یہ ضیغم کی آواز تھی۔

''نہیں...... انہیں مت چھیڑنا...... بس روشنی بند کر کے نکل چلو۔ خود ہی جاگیں گے اور اپنے بیڈ روم میں چلے جائیں گے۔ سونے سے جگایا جانا بالکل پسند نہیں کرتے، خواہ کہیں سو گئے ہوں۔''

پھر حمید نے سوئچ آف ہونے کی آواز سنی اور آنکھوں میں خفیف سا درہ کر کے دیکھا۔ کمرہ تاریک تھا اس کے بعد کوئی آواز نہ سنائی دی۔

حمید نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی۔ بہرحال اسے تو ان کا تعاقب کرنا تھا۔ اس لئے زیادہ دور اندیشی کو بھی راہ نہیں دی جاسکتی تھی۔

وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ''پرنس...... تم کہاں ہو۔''

''میں بے ہوش پڑا ہوں۔'' حمید نے بھی سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

''چپ چاپ باہر نکل آؤ...... دور تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

وہ اندازے سے باہر نکل آیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے پیروں کی چاپ سنی تھی۔ یہاں بھی اندھیرا تھا اور دردانہ اس کے قریب کھڑی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''تم نے تو کمال کر دیا۔ بڑی خوبصورتی سے بیہوش ہوئے تھے۔ وہ لوگ پرانی باؤلی کی طرف گئے ہیں۔''

''پرانی باؤلی تک میری رہنمائی کرو۔'' حمید بولا۔

''یقیناً کروں گی۔ میں ڈرپوک تو نہیں ہوں۔ وہاں بھیڑیا بھی ہوگا۔ خدا کی پناہ ضیغم نے کہا تھا کہ وہ اس کا پالتو بھیڑیا ہے۔''

''ہاں کچھ لوگ بھیڑیئے بھی پالتے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے وہ اب تک کئی لوگوں کی جانیں لے چکا ہے۔ تم خود سوچو...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا ماموں زاد بھائی اتنا اذیت پسند ہوگا۔''

''ہمیں جلد از جلد ان کا پیچھا کرنا چاہئے۔ تم بس دور سے باؤلی دکھا کر واپس آجانا۔''

''یہ ناممکن ہے۔ میں بھی چلوں گی۔ پورے انتظام کے ساتھ آئی ہوں۔ میرے تھیلے میں ٹارچ پستول اور وافر تعداد میں کارتوس موجود ہیں۔''

''بے بی کان......وہاں گولیاں بھی چل سکتی ہیں۔''

''پستول اور کارتوس نمائش کے لئے نہیں لائی۔ چلو جلدی کرو۔ میری اسپورٹ کار باہر موجود ہے۔ وہ عام راستے سے گئے ہوں گے میں دوسری طرف سے لے چلوں گی۔''

''یہ اور بھی اچھا ہوگا۔''

کچھ دور چل کر اسپورٹ کار کچے راستے پر اتار دی گئی۔ دردانہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی اور حمید سوچ رہا تھا۔ کاش وہ سچ مچ اس کی چچا زاد بہن ہوتی۔ ڈرائیونگ کے معاملے میں بھی بڑی نڈر لڑکی تھی۔

''اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ زیگم بڑا کمینہ آدمی ہے اور ماموں جان کو کیا کہوں۔ لیکن یہ بُری بات ہے کہ زیگم نے بھیریا پال رکھا ہے اور یہ مشہور کرا دیا ہے کہ وہ دادا جان والے بھیریئے کی روح ہے۔''

''آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔''

''دیکھو جگلر کی توپی سے کیا برآمد ہوتا ہے۔ پتہ نہیں باؤلی میں کیا ہے جسے محفوظ رکھنے کے لئے وہاں ایک بھیریا ضروری سمجھا گیا۔ کیا میں گلت کہہ رہا ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہاں ضرور کچھ ہے۔''

''اور وہ بوڑھا مردود میری شادی کرانے نہیں آیا باؤلی ہی کی کچھ بات معلوم ہوتی ہے۔''

''شادی کی بات نہ کرو۔'' دردانہ غرائی۔

''محبت کی کروں۔''

''بالکل خاموش بیٹھو۔''

''کیا تم اب تک مجھ سے ناراض ہو۔''

''میں سارے مردوں سے ناراض ہوں۔''

حمید پھر نہ بولا۔ گاڑی کچھ دیر بعد رک گئی اور دردانہ نے حمید سے اترنے کو کہا۔

ویسے اس کے لہجے سے حمید نے اندازہ کرلیا کہ وہ اس کے اس طرح خاموش رہ جانے

پر کسی قدر ناراض ہے۔

''تم مجھے باؤلی تک پہنچا کر واپس جاؤ گی۔'' حمید نے اس سے کہا۔

''بیوقوفی کی باتیں نہ کرو.... تمہیں وہاں قدم قدم پر میری رہنمائی کی ضرورت پڑے گی۔''

''تمہیں بھیڑیئے سے کوف نہیں معلوم ہوتا۔''

''تمہاری موجودگی میں خوف نہ معلوم ہوگا۔ اچھا اب خاموشی سے چلو۔'' دردانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

باؤلی کے قریب پہنچ کر وہ پھر رکے تھے۔ یہاں دور تک قد آدم جھاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور باؤلی بھی انہیں کے درمیان کہیں پوشیدہ تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ جھینگروں کی جھائیں جھائیں کے علاوہ اور کسی قسم کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

دردانہ نے ٹارچ روشن کی اور حمید کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی جھاڑیوں میں گھس پڑی۔ کچھ دور چلنے کے بعد جھاڑیوں کے درمیان ہی انہیں ایک چھوٹی سی کار دکھائی دی جو خالی تھی۔

''یہ ضیغم کی گاڑی ہے۔'' دردانہ نے آہستہ سے کہا۔

''مارو گولی......تم آگے چلتی رہو۔'' حمید شانوں کو جنبش دے کر بولا۔

کچھ دور چل کر اچانک وہ پھر رک گئی اور مڑ کر حمید سے بولی۔ ''بھیڑیا۔''

''کہاں......!''

''مر چکا......!''

''اوہو......اسے مارا کس نے۔ میری گن کے چھرے اس کے پاؤں میں لگے ہوں گے لیکن یہ بڑی گولی۔''

''ہوسکتا ہے ضیغم ہی نے اسے ختم کردیا ہو۔ ایک اجنبی بھی تو ساتھ ہے اس کے۔ ہوسکتا ہے اس نے بوڑھے صمدانی پر حملہ کیا ہو۔''

''اسے بوڑھا صمدانی نہ کہو......جوان صمدانی کہو......بہت تا کتور ہے۔''

''ہونہہ......چلو آگے بڑھو......اب تمہیں آگے چلنا چاہئے۔ میں پیچھے سے روشنی دکھاؤں گی۔''

''فرانس میں عورتیں آگے چلتی ہیں۔ مجھ سے یہ بے ادبی نہیں ہوسکتی۔''

''باتیں نہ بناؤ...... چلو......!'' وہ پیچھے ہٹ کر اسے آگے دھکیلتی ہوئی بولی۔ حمید پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس کی چوڑائی دو فٹ سے زیادہ نہیں تھی اور دونوں جانب ان کے سروں سے اونچی جھاڑیاں تھیں۔

دفعتاً حمید نے جیب سے وہ اسپرنگ نکالے جنہیں نتھنوں میں فٹ کر لینے سے دہانے کی بناوٹ تبدیل ہو جاتی تھی۔

باؤلی کے بالکل قریب پہنچ کر دردانہ نے ہوشیار رہنے کو کہا۔

وہ بہت بڑے قطر کا کنواں تھا۔ جسکی جگت کی اونچائی کم از کم تین فٹ ضرور رہی ہوگی۔ چار سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچے۔ انہی سیڑھیوں کی سیدھ میں نیچے جانیوالے زینے تھے۔

شائد اسی دوران میں دردانہ کی نظر حمید کے چہرے پر پڑ گئی تھی۔

''اوہو...... یہ کیا......؟'' وہ چونک پڑی۔

''کیا ہوا......؟''

''تمہاری شکل......!''

''فکر نہ کرو...... میں نہیں چاہتا کہ صمدانی مجھے پہچان سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے اس مہم پر ساتھ نہیں لانا چاہتا تھا اسی لئے اس نے کافی میں بے ہوشی کا کیپسول ڈالا تھا۔ ابا حضور کی ہدایت تھی کہ صمدانی کی مرضی پر چلوں۔ جو کچھ کہے وہی کروں۔''

''آخر تم میں کتنے کمالات ہیں...... اس طرح مسلسل اوپری ہونٹ اوپر اٹھائے رکھ کر گفتگو کرتے رہنا آسان کام تو نہیں ہے...... اور یہ ناک بھی تو اوپر اٹھ گئی ہے۔'' دردانہ نے اس کی ناک کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''ابھی نہیں...... بعد میں۔''

''خیر اب میں ٹارچ نہیں روشن کروں گی۔ دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ اترتے چلو۔ میں تمہارے کاندھے پر ہاتھ رکھ لوں گی۔''

وہ آہستہ آہستہ نیچے اترتے رہے۔ زینوں کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دریچوں کے سلسلے نیچے تک چلے گئے تھے۔ ان سے ہوشیار رہنے کے لئے خاص طور پر دردانہ نے ہدایت کی تھی۔

کچھ ہی زینے طے کئے تھے کہ داہنی جانب والے ایک دریچے میں روشنی دکھائی دی اور دردانہ نے حمید کا شانہ دبا کر رک جانے کا اشارہ کیا۔ جن زینے پر وہ کھڑے ہوئے تھے دریچہ اس سے بھی قریباً دو ڈھائی فٹ اونچا تھا اور کمرے میں پہنچنے کا راستہ بھی یہی تھا۔ حمید آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دریچے کے ایک پہلو سے جالگا۔ خود اس کے پس منظر میں تاریکی تھی اور کمرے کی روشنی اتنی محدود تھی کہ اندر سے اس کے دیکھ لئے جانے کا امکان نہیں تھا۔

اس نے ان تینوں کو دیکھا جو ایک موم بتی کی روشنی میں بڑے غور سے سامنے والی دیوار کا جائزہ لے رہے تھے۔ دردانہ اس کی پشت پر لدی ہوئی کمرے میں جھانک رہی تھی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' دفعتاً صمدانی کی آواز آئی۔ ''ابھی تک ہم بھیڑیا ہی نہیں تلاش کر سکے۔''

حمید نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ دیوار پر بنے ہوئے ایک پیٹرن کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یہ فرش سے دو فٹ کی اونچائی تک دیوار پر چاروں طرف بنا ہوا تھا۔ مختلف جانوروں کی تصویریں اس طرح ترتیب دی گئی تھیں کہ گل بوٹے سے معلوم ہوتے تھے۔

''اوہو...... یہ رہا...... پھر سے دیکھ لو...... پورے پیٹرن میں اس بھیڑیئے کے علاوہ کوئی دوسرا بھیڑیا موجود نہیں۔'' صمدانی نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا اور وہ دونوں باپ بیٹے ایک بار پھر چاروں طرف گھوم کر اس کے بیان کی تصدیق کر آئے۔

''کوئی دوسرا نہیں ہے۔'' سردار قاہر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھا تو پھر کام شروع کردو......!'' صمدانی نے ضیغم کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

حمید گرم گرم سانسیں اپنے بائیں گال پر محسوس کر رہا تھا اور اب اسے قطعاً دلچسپی نہیں رہی تھی کہ کمرے کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ بس وہ ایک غیر جانبدار تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھے جا رہا تھا۔

ضیغم نے چرمی تھیلے سے کچھ اوزار نکالے اور بھیڑیئے کی تصویر پر سے پلاسٹر ادھیڑنا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے دیوار میں خاصا بڑا گڑھا بنا دیا تھا۔

دفعتاً صمدانی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''ٹھہر جاؤ......!'' اور قاہر کے ہاتھ سے موم بتی لے کر گڑھے کے قریب لایا...... اس کے بعد اس نے داہنا ہاتھ گڑھے میں ڈالا تھا اور ایک

صندوقچی نکال لی تھی۔

''اوہو! اوہو......!'' دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

''اسے کھولئے......اسے کھولئے۔'' ضیغم نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

''نہیں......!'' صمدانی کا لہجہ بے حد سخت تھا۔ ''اب تم دونوں کو اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔''

''یہ......یہ......تو زیادتی ہے صمدانی بھائی۔'' قاہر گھگھیایا۔

''جی ہاں......جناب۔'' ضیغم کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

ٹھیک اسی وقت چھت کی تاریکی سے ایک سیاہ فام آدمی صمدانی پر آ کودا اور اس کے ہاتھ سے صندوقچی چھینتا ہوا دور جا کھڑا ہوا۔

حمید نے طویل سانس لی۔ یہ چوتھا آدمی سرتاپا سیاہ پوش تھا۔ لباس کھال کی طرح پورے جسم پر منڈھا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے اور چمکدار آنکھیں ان سے صاف نظر آ رہی تھیں۔

''صندوقچی زمین پر ڈال دو......!'' صمدانی نے گرج کر کہا۔

''بکواس مت کرو......ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا۔'' سیاہ پوش بولا۔ حمید کی جان میں مزید جان آئی۔ آواز فریدی ہی کی تھی۔

صمدانی نے فائر کر دیا۔

''بس......!'' سیاہ پوش نے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد صمدانی نے بقیہ پانچ کارتوس بھی خالی کر دیئے تھے لیکن سیاہ پوش اب بھی اس طرح کھڑا حقارت سے ہنس رہا تھا۔

اچانک قاہر اور ضیغم ''بھوت بھوت'' چیختے ہوئے اس دریچے کی طرف بھاگے جس کی دوسری طرف حمید اور دردانہ کھڑے تھے۔

حمید نے مکے مار مار کر ان دونوں کو پھر کمرے کے وسط میں پہنچا دیا۔ ادھر صمدانی سیاہ پوش سے لپٹ پڑا تھا۔ صندوقچی اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ لیکن ان دونوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے اٹھا لیتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بُری طرح کانپ رہے تھے اور ان کی خوفزدہ چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

حمید بھی کمرے میں کود جاتا لیکن دردانہ نے اس کی کمر تھام لی۔

''یہ کیا کر رہی ہو۔'' حمید بھنا کر بولا۔

''میں تمہیں اندر نہیں جانے دوں گی۔ تم نے دیکھا نہیں کہ چھ گولیاں کھانے کے بعد بھی وہ صمدانی سے چمٹا ہوا ہے۔''

''میرا بڑا بھائی ہے...... مجھے جانے دو۔'' حمید نے کہا اور ناک سے اسپرنگ نکال کر جیب میں ڈال لئے۔

اس کے بعد وہ دردانہ سمیت کمرے میں کود گیا تھا۔ وہ اسے بُرا بھلا ہی کہتی رہ گئی تھی۔

''پرنس......؟'' صمدانی پُر مسرت لہجے میں چیخا۔ ''میری مدد کرو۔''

''میں بھوتوں سے چہل نہیں کرتا۔'' حمید نے لاپروائی سے کہا اور صندوقچی فرش سے اٹھالی۔

''اچھا......اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔''

''نہیں......تمہاری کشتی میں مزا آرہا ہے۔ میں یہیں رک کر تماشہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

دردانہ دونوں کے قریب جا کھڑی ہوئی تھی۔

''بھبھ...... بھاگو بیٹی......بھوت......!'' قاہر کانپتا ہوا چیخا۔ ''پرنس بھاگو......مم...... مجھے بھی نکال لے چلو۔''

''بھوت ہی... معلوم ہوتا ہے۔'' صمدانی سیاہ پوش سے گتھا ہوا بڑبڑایا۔ ''پتھر کا ہے پتھر!''

اور پھر اس پتھریلے بھوت نے صمدانی کو سر سے اونچا اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔

صمدانی کی چیخ بڑی کرب ناک تھی۔ اس کے بعد وہ نہیں اٹھ سکا تھا۔

''برادرم بھوت......کیا یہ مرگیا۔'' حمید نے سیاہ پوش سے پوچھا۔

''پتہ نہیں......خود دیکھ لو۔'' اس نے جواب میں کہا اور حمید کے ہاتھ سے صندوقچی چھین کر دریچے سے باہر چھلانگ لگادی۔

عجیب سا سناٹا کمرے کی فضا پر مسلط تھا۔ بھوت کی روانگی کے بعد ہی دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے اور خاموش کھڑے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔

حمید صمدانی پر جھکا ہوا تھا۔ وہ بیہوش تھا۔ شائد داہنے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کیونکہ داہنا ہاتھ تیزی سے متورم ہوتا جارہا تھا۔

جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو قاہر نے پوچھا۔ ''کک کیا..... مر گئے صمدانی بھائی۔''

''بیہوش ہو گیا ہے..... بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔''

''ہمیں یہاں سے نکال لے چلئے پرنس! جتنی جلدی ممکن ہو۔'' قاہر نے بڑی لجاجت سے کہا۔

اچانک ضیغم چونک کر بولا۔ ''مم..... میرا بھیڑیا۔''

''تمہارا بھیڑیا..... تم نے تو اسے گولی مار دی تھی۔''

''نن..... نہیں.....!'' ضیغم بوکھلا کر بولا۔

''ہم نے راستے میں اس کی لاش دیکھی تھی۔'' دردانہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے نفرت ہو گئی ہے تم سے۔''

''ہم دونوں کو معاف کر دو بیٹی۔'' قاہر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے بتایئے یہ..... یہ سب کیا ہے۔''

''یہ ہماری کمینگی کی کہانی ہے بیٹی۔ گھر چلو..... میں سب کچھ بتا دوں گا۔''

اتنے میں ضیغم ''میرا بھیڑیا.... میرا بھیڑیا'' چیختا ہوا دریچے کی طرف جھپٹا اور باہر کود گیا۔

''اوہ..... جہنم میں جائے بھیڑیا۔'' قاہر بڑبڑایا۔ ''پرنس خدا کے لئے یہاں سے چلو..... وہ صندوقچی تمہارے باپ کی ملکیت تھی۔''

''کیا مطلب.....؟'' دردانہ چونک پڑی۔

''گھر چلو..... وہیں سب بتاؤں گا۔''

اتنے میں کئی لوگ دریچے سے اندر کود آئے۔ ان کے جسموں پر ریاستی پولیس کی وردیاں تھیں۔

''اوہو..... ولی خان۔'' قاہر ایک آدمی کی طرف ہاتھ اٹھا کر چہکا۔

''میں خان کے حکم سے آپ کو گرفتار کرتا ہوں۔'' اس نے ہتھکڑیاں نکالتے ہوئے کہا۔

''کک..... کیوں..... خخ..... خان..... تو بول بھی نہیں سکتے۔''

''بحمد اللہ وہ اس وقت کوتوالی میں تشریف رکھتے ہیں اور سردار ضیغم کو برخواست کر کے مجھے پولیس کا سربراہ بنایا ہے۔''

''اللہ ......رحم......!'' قاہر نے کہا اور چکرا کر گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ سپاہیوں نے قاہر اور صمدانی کو اٹھایا۔

''تشریف لے چلئے آپ بھی۔'' ولی خان نے حمید اور دردانہ سے مؤدبانہ کہا۔

دونوں خاموشی سے باہر آئے۔ کنوئیں کی جگت پر پہنچے ہی تھے کہ انہوں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ حمید اور ولی خان آواز کی طرف جھپٹے تھے اور پھر جب اس جگہ پہنچے جہاں بھیڑیئے کی لاش دیکھی تو سناٹے میں آ گئے۔ بھیڑیئے کے قریب ہی ضیغم خون میں نہایا ہوا تڑپ رہا تھا۔

''خودکشی جناب۔'' ولی خان ٹارچ کی روشنی میں اس پر جھکتا ہوا بولا۔ ''ریوالور اس کے ہاتھ میں موجود ہے۔ داہنی کنپٹی پر فائر کیا تھا......ظالموں پر اللہ ہے۔''

محل پہنچ کر حمید اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔ دفعتاً پہلی بار اسے اپنے ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ فریدی اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ بہت احتیاط سے اسی جگہ پہنچ جائے جہاں اس نے بھیڑیئے پر فائر کیا تھا۔ احتیاط کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ وہ چھپ کر محل سے نکلے۔ حمید نے اس حصے کی لائٹ آف کردی اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکل آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی قبرستان سے گزر رہا ہو۔ بس وہ اندازے سے چلا جا رہا تھا ورنہ اس اندھیرے میں یہ پتہ چلنا بے حد مشکل تھا کہ اس نے کس جگہ سے بھیڑیئے پر فائر کیا تھا۔

اچانک کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی کی زد میں آ گیا۔ گاڑی اس کی طرف آ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر وہ رک گئی اور انڈیکیٹنگ لائٹ کے ذریعہ اشارہ ملنے لگا کہ ''ادھر آ جاؤ۔''

ایسے حالات میں یہ فریدی کا مخصوص انداز تھا۔ حمید گاڑی کی طرف جھپٹا اور اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر فریدی کے برابر بیٹھ گیا۔ صمدانی پچھلی سیٹ پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اچانک اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میری نیت بخیر تھی۔ میں اعتماد الدولہ کی امانت ان کے بیٹے تک پہنچا دیتا۔''

فریدی کچھ نہ بولا۔ کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے بونٹ پر چھوٹی سی جھنڈی لہرا رہی تھی۔ غالباً وہ اسی جھنڈی کا اعجاز تھا کہ قلعہ کے پھاٹک کے پہرہ داروں نے انہیں تعظیم دی تھی اور گاڑی پھاٹک سے نکل گئی تھی۔

صبح تک وہ شہر پہنچ سکے تھے۔ اس بار سفر کار ہی سے ہوا تھا اور فریدی ایک بوڑھے

پولیس آفیسر کے میک اپ میں تھا۔حمید کا خیال تھا کہ وہ خان ظفر یاب سے اسی میک اپ میں ملا ہوگا......تب ہی تو صمدانی کو ان لوگوں کی حراست سے نکال پایا۔

اپنی کوٹھی کے قریب گاڑی روک کر فریدی نے حمید سے کہا۔''میں تم سے بہت خوش ہوں۔تم نے اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے انجام دیا۔اب جاؤ آرام کرو۔''

وہ اسے گاڑی سے اتار کر صمدانی سمیت کہیں اور چلا گیا تھا۔

حمید کی دو راتیں برباد ہوئی تھیں۔لہٰذا لباس تبدیل کئے بغیر جو بستر پر گرا تو شام ہی کی خبر لی۔پھر جاگا تو ایک ملازم چھوٹا سا وائر ریکارڈر تھما کر رفو چکر ہوگیا۔وائر ریکارڈر فریدی کا تھا جس میں بسا اوقات وہ حمید کے لئے ہدایات ریکارڈ کر جایا کرتا تھا۔حمید نے اس کا سوئچ آن کر دیا۔فریدی کی آواز آئی۔

''حمید میں دو دن کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ظاہر ہے کہ یہ دو دن تمہارے لئے بے حد صبر آزما ہوں گے اس لئے صمدانی والے کیس کی مختصر رپورٹ چھوڑے جا رہا ہوں۔یہ سپرنٹنڈنٹ کے دوست اقتدار الدولہ کا ایک نجی معاملہ تھا۔یہ حقیقت ہے کہ اقتدار الدولہ کا لڑکا افتخار الدولہ پانچ سال کی عمر سے پیرس میں مقیم ہے اور اس وقت سے آج تک یہاں نہیں آیا۔اس خاندان کی کہانی جو تم نے صمدانی سے سنی ہے حرف بحرف صحیح تھی۔خان دوراں اور اقتدار کے باپ اعتماد الدولہ جڑواں بھائی تھے اور ان کے مصاحبین میں سردار قاہر اور صمدانی کے باپ قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔اعتماد الدولہ کے باپ نے مرتے وقت ان دونوں کو بلا کر جواہرات پر مشتمل ایک خزانے کا امین بنایا۔وہ ان جواہرات کو اعتماد الدولہ کے لئے مخصوص رکھنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی جائیداد میں سے اعتماد الدولہ کو کچھ بھی نہ ملتا۔اس جائیداد کا بٹوارہ کبھی نہیں ہوا تھا۔وہ ہر دور میں سب سے بڑے بیٹے کی تحویل رہی تھی اور وہی خاندان کے بقیہ افراد کی کفالت کرتا تھا۔بہرحال اس خزانے کا نصف نقشہ قاہر کے باپ کے سپرد کیا گیا اور آدھا نقشہ صمدانی کے باپ کو دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اگر اعتماد الدولہ اسے قبول کرنے پر تیار نہ ہوں تو وہ ان کے بعد ان کی اولاد کے سپرد کر دیا جائے۔لیکن وہ دونوں مصاحبین بے ایمانی پر اتر آئے اور اعتماد الدولہ کے والد کے انتقال کے بعد وہ آدھے نقشہ کے لئے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوگئے۔لیکن ان میں سے کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔صمدانی

کا باپ مرتے وقت آدھا نقشہ اپنے بیٹے قاہر کے سپرد کرتے ہوئے وصیت کر گیا کہ وہ صمدانی سے دوسرا نصف حاصل کر کے پورا نقشہ اقتدار الدولہ تک پہنچا دے لیکن قاہر کی نیت بھی بدل گئی۔ اب قاہر اور صمدانی میں ٹھن گئی۔ ادھر قاہر جو خان ظفر یاب کا سالا بھی تھا اس کوشش میں لگ گیا کہ دردانہ کی شادی اقتدار الدولہ کے بیٹے کی بجائے اس کے بیٹے ضیغم سے ہو۔ آخر اس نے خان ظفر یاب کو قید کر کے یہ بات مشہور کرادی کہ وہ سخت بیمار ہیں۔ گھر والوں تک کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ادھر ضیغم نے باؤلی میں ایک بھیڑیا پالا کیونکہ ان کے پاس والے آدھے نقشے سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ جو کچھ بھی ہے باؤلی ہی میں ہے۔ یہ بھیڑیا اس لئے پالا گیا تھا کہ صمدانی اور اس کے حواری ان کی لاعلمی میں باؤلی میں داخل نہ ہوسکیں۔ ادھر قاہر کے باپ کا پیغام ملتے ہی اقتدار الدولہ نے صمدانی سے آدھے نقشے کا مطالبہ کیا۔ صمدانی نے اس سے لاعلمی ظاہر کی۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ وہ اقتدار الدولہ کی ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ ابھی حال ہی میں جب یہ بات میرے علم میں آئی تو میں نے سپرنٹنڈنٹ کو یہی مشورہ دیا جس پر تم عمل کر چکے ہو۔ اقتدار الدولہ نے صمدانی سے استدعا کی کہ وہ ان کے بیٹے کے لئے وہی روایتی فریضہ ادا کرے جو خود ان کے لئے ان کے باپ نے ادا کیا تھا۔ صمدانی کو منہ مانگی مراد ملی۔ اس طرح وہ خان دوراں کے قلعے میں بہ آسانی داخل ہوسکتا۔ لیکن اگر اسے اس کا علم ہوتا کہ قاہر پوری طرح قلعے پر تسلط جما چکا ہے تو شائد وہ ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ میں خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ خان ظفر یاب بہت زیادہ بیمار ہیں۔ اگر ہم اس طرح وہاں نہ پہنچتے تو ان کی رہائی ناممکن ہوتی اور وہ موقعہ پا کر انہیں اس طرح ختم کر دیتے کہ طویل علالت کے بعد قدرتی موت کا گمان ہوتا۔ تمہیں ان حالات سے اس لئے لاعلم رکھا گیا تھا کہ مختلف مواقع پر تمہاری حیرت صداقت پر مبنی ہو۔ ایکٹنگ نہ معلوم ہو۔ صمدانی بے حد چالاک ہے۔''

تقریر ختم ہوگئی اور حمید نے ریکارڈر کو آف کر کے سر کھجانا شروع کر دیا۔ طرح طرح کے منہ بن رہے تھے۔ لیکن بے بی خان...... اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اُٹھ کر باتھ روم کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کیس کے دوران وہ یہی تو کرتا رہا تھا۔

تمام شد